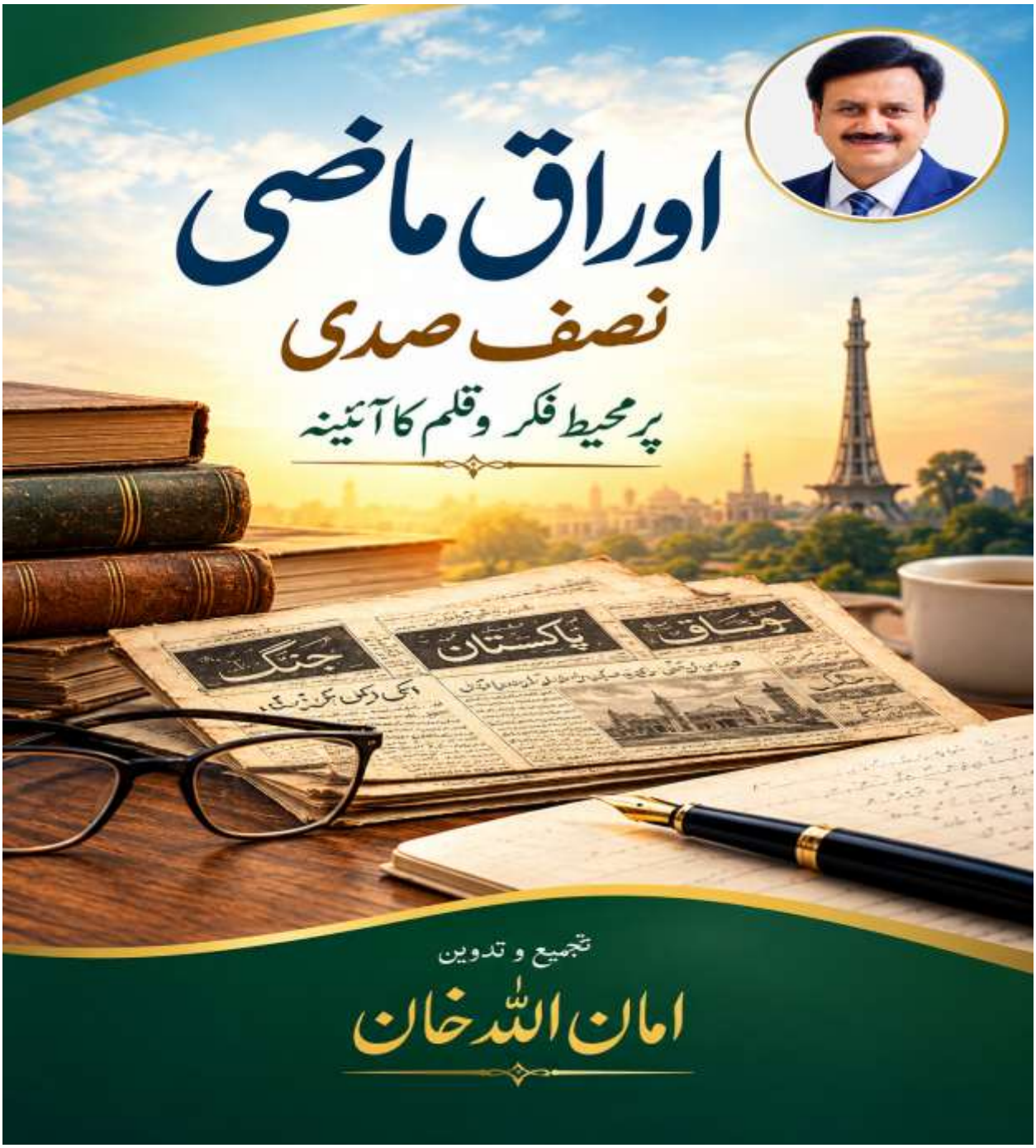
اوراق ماضی
نصف صدی
پر محیط فکر و قلم کا آئینہ
جنگ
پاکستان
ہمارا
تجمیع و تدوین
امان اللہ خان

اوراقِ ماضی-نصف صدی پر محیط فکر و قلم کا آئینہ

پیش لفظ

قارئین محترم! دوروز قبل "اخباری تراشوں نے کھولے ماضی کے بند دریچے "لانچ کرتے وقت ــــ جو میری مختلف نوعیت کی سرگرمیوں کے بارے میں اخبارات میں شائع شدہ خبروں پر مبنی تھی ــــ میں نے ان مضامین کا بھی ذکر کیا تھا جو ان پرانے کاغذات سے نکلے۔ ان اخباری مضامین کے تراشوں کو یکجا کر کے ایک کتابچے کی شکل دے دی گئی ہے۔ یہ میرے 1976ء سے شروع کیے گئے سفر کے ارتقائی عمل کی عکاس بھی ہے۔ فیس بک پر آپ روزانہ کسی نہ کسی موضوع پر میری پوسٹنگ دیکھتے رہتے ہیں، مگر شاید کم ہی احباب کو معلوم ہو کہ یہ سلسلہ کوئی نیا نہیں بلکہ ایک طویل سفر کا تسلسل ہے جس کی جڑیں چار دہائیوں سے زیادہ پرانی ہیں۔ جب میں نے 1976ء میں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا، تو اس وقت نہ سوشل میڈیا کا تصور تھا، نہ فوری اظہارِ خیال کی کوئی سہولت۔ اس دور میں کسی موضوع پر اپنی رائے قوم تک پہنچانے کا واحد ذریعہ اخبار ہی ہوا کرتا تھا، اور وہ بھی اس وقت جب ادارتی صفحہ پر جگہ پانا کسی اعزاز سے کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ نوائے وقت، روزنامہ جنگ، روزنامہ پاکستان، وفاق اور سیاست جیسے موقر اخبارات میں شائع ہونے والی یہ تحریریں دراصل ایک نوجوان قلم کار کی اس جستجو کا نتیجہ تھیں جو اپنے معاشرے کے مسائل کو سمجھنے اور ان پر آواز اٹھانے کی خواہش رکھتا تھا

۔جب میں نے برسوں بعد یہ زرد اور بوسیدہ تراشے دوبارہ ہاتھ میں لیے، تو عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ کچھ مضامین پڑھ کر ایسا لگا جیسے یہ کل کی بات ہو، اور کچھ پر یہ احساس ہوا کہ وقت نے میری سوچ کو کس قدر جِلا بخشی ہے۔ تعلیم، معاشرت، قومی نظریہ، مذہبی اقدار اور روزمرہ زندگی کے مسائل ــــ یہ سب موضوعات ایسے ہیں جن پر میں نے نوجوانی کے ایام میں بھی قلم اٹھایا اور بعد کے برسوں میں بھی، بلکہ آج بھی فیس بک کی وساطت سے انہی جیسے موضوعات پر لکھتا رہتا ہوں۔ یہی تسلسل دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ کچھ مسائل معاشرے سے کبھی رخصت نہیں ہوتے، البتہ ان سے نبرد آزما ہونے کا انداز اور فہم وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے

۔اس کتابچے کو مرتب کرنے کا خیال دراصل ایک جذباتی اور تاریخی، دونوں نوعیت کا محرک رکھتا ہے۔ جذباتی اس لحاظ سے کہ یہ میری اپنی فکری زندگی کا ابتدائی نقشِ قدم ہے، اور تاریخی اس لحاظ سے کہ یہ تحریریں پاکستانی معاشرے کے ایک مخصوص دور کی عکاسی کرتی ہیں ــــ وہ دور جب تعلیمی ادارے، صحافت، اور سماجی رویے ایک خاص کروٹ لے رہے تھے۔ میری خواہش ہے کہ یہ تراشے، جو برسوں الماریوں میں دبے رہے، اب ایک مرتب شکل میں محفوظ ہو جائیں تاکہ نہ صرف میرے احباب اور خاندان بلکہ ہر وہ قاری بھی ان سے استفادہ کر سکے جو پاکستانی صحافت اور سماجی فکر کی تاریخ میں دلچسپی رکھتا ہے۔

میں اس موقع پر ان تمام قارئین اور فیس بک احباب کا بھی شکر گزار ہوں جو برسوں سے میری تحریروں کو پڑھتے، سراہتے اور ان پر رائے دیتے رہے ہیں۔ آپ کی یہی پذیرائی ہے جس نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ ماضی کے یہ اوراق دوبارہ سے سمیٹے جائیں اور ایک مربوط انداز میں پیش کیے جائیں۔ امید ہے کہ یہ کتابچہ آپ کو نہ صرف ماضی کی سیر کرائے گا بلکہ اس بات کا بھی احساس دلائے گا کہ فکر و قلم کا سفر کبھی رکتا نہیں ــــ بس اس کے اظہار کے وسیلے بدلتے رہتے ہیں۔ تو قارئین محترم حسب سابق اپ کی قیمتی آراء کا انتظار رہے گا

امان اللہ خان

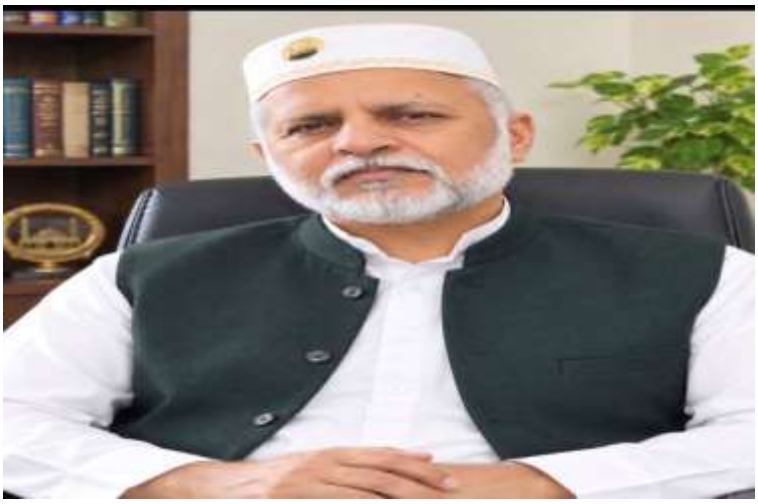

امان اللہ خان کے مطبوعہ مضامین کا تجزیاتی جائزہ

امان اللہ خان سے میرا تعلق 1975 سے ہے جب وہ ادارہ تعلیم و تحقیق میں بطور طالب علم داخل ہوئے۔ مجھے ان کے کلاس فیلو ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ وہ یونیورسٹی میں انے سے قبل طلبا سیاست میں ایک موثر کردار ادا کر رہے تھے اور طلباء کی ایک رائٹ ونگ تنظیم نے انہیں ادارہ تعلیم و تحقیق کی نظامت کی زمہ داری دے رکھی تھی اور نیو کمپس کے نشر و اشاعت کے کام کو بھی اگے بڑھاتے تھے

طلباء یونین کے الیکشن میں مجھے جب صدر کے لئے منتخب کیا گیا تو انہون نے سینئر نائب صدر کے لئے خود الیکشن لڑا اور بطور ناظم پورے پینل کو کامیابی نصیب ہوئی۔ مقرر کے علاوہ انہی کتب بینی اور اخبارات ور سائل مین لکھنے کا شوق بھی تھا۔ اکثر ان کے مختلف موضوعات پر مضمون چھپتے رہتے تھے۔ انہیں شروع میں غزل گوئی اور افسانہ نگاری کا بھی شوق رہا اور ادارہ تعلیم و تحقیق کے مجلہ مین چھپتے بھی رہیے۔ مگر بعد ازاں انہوں نے مضمون نگاری پر فوکس کیا۔

فراغت تعلیم کے بعد وہ پاکستان نیوی کے شعبہ تعلیم۔ سے منسلک ہوگئے اور وہاں بھی لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر ان کی منزل سول سروس تھی اور وہ پنجاب کی سول بیوروکریسی کا ایک حصہ بن گئے۔ اس دوران ان کے لکھنے لکھانے کا سلسلہ ختم ہو گیا اور وہ سروس میں ہی گم ہو گئے۔ مگر بعد مین نوے کی دہائی مین وہ پھر لکھنے لگے اور پھر ایک طویل بریک۔۔۔۔ پھر اچانک وہ سوشل میڈیا پر ان ہوئے اور جنوری 2026 سے جولائی 26 تک سوشل میڈیا میں لکھے گئے ارٹیکل ایک کتابی صورت مین سامنے ائے اور مجھے بھی اس کی ایک ڈیجیٹل کاپی ملی۔ ان کی تحریر میں کافی نکھار اور پختگی دیکھی گئی۔

چند دن قبل انہوں نے مجھے مختلف دور میں اخبارات مین چھپنے والے مضامین کا مسودہ بھیجا اور حکم یوا کہ میں اسے پڑھوں اور اس پر غیر جانبدارانہ تبصرہ بھی کروں مین نے انہین اپنی خراب صحت کا بھی بتایا مگر ۔۔۔۔ امان اللہ خان کو نہ کہنے کی ہمت کسی دوست میں نہین۔ لہزہ چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ حاضر خدمت ہین

اس کتاب میں 1976 تا 1998ء کے دوران مختلف پاکستانی اخبارات میں شائع شدہ امان اللہ خان کی تحریریں شامل ہیں

اور ان کا قلم کسی ایک شعبے تک محدود نہیں رہا بلکہ وسیع تر سماجی، معاشی، مذہبی اور سیاسی میدانوں کا احاطہ کرتا ہے۔ جن میں اہم موضوعات حسب زیل ہیں

1۔ سماجی و اخلاقی اصلاح: سگریٹ نوشی کو "موت کا پروانہ" قرار دینا، ٹیکس چوری کے پہلو، غلاظت اور صفائی کے مسائل، بسوں و سفر کے مسافروں کی مشکلات۔

2 ۔ تعلیم و نوجوان نسل: طلبہ تنظیموں پر پابندی، تعلیمی اداروں میں تدریسی معیار، پرائمری اساتذہ کی اہمیت، امتحانی نظام کی خرابیاں—یہ ایک بار بار لوٹنے والا موضوع ہے۔ •

3 ۔ قومی نظریہ و شناخت: "نوجوان نسل اور نظریہ پاکستان"، اردو بطور قومی زبان، ثقافتی یلغار (بھارتی ٹی وی کے اثرات) جیسے مضامین قومی تشخص کے تحفظ کی فکر ظاہر کرتے ہیں۔ •

4۔ معیشت وانتظامیہ: تیل کی قیمتوں میں اضافہ اور اس کے اقتصادی نقصانات، عدلیہ کی تنظیمِ نو، وفاقی شرعی عدالت، بیوروکریسی اور کرپشن پر تنقید۔
۔5 بین الاقوامی امور: خلیجی جنگ (عراق پر حملے کے اثرات) پر تبصرہ، جو مقامی مسائل سے آگے عالمی سیاست پر بھی گہری نظر ظاہر کرتا ہے۔ •
6۔ تحقیق وعلمیت: "تحقیق اور اس کی اہمیت" جیسا مضمون خود مصنف کے علمی و تحقیقی مزاج کی عکاسی کرتا ہے

ان کا اسلوبِ نگارش بھی بہت مبفرد ہے زیادہ تر عنوانات سوالیہ یا استفہامی انداز میں ہیں ("کیا عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی ممکن ہے؟"، "کیا گزرا ہوا وقت کبھی واپس آ سکتا ہے؟")، جو قاری کو سوچنے پر اکسانے کی صحافتی حکمتِ عملی ہے۔• زبان سادہ، براہِ راست اور استدلالی ہے—پر تکلف ادبی صنعتوں سے گریز کرتے ہوئے عام قاری تک بات پہنچانے کی کوشش نمایاں ہے۔• اعداد و شمار، تاریخی حوالوں اور موازنوں (جیسے 1973–74ء اور 1990–91ء کے تقابلی جدول) کا استعمال تجزیاتی اور دستاویزی صحافت کی طرف رجحان ظاہر کرتا ہے۔• کالم نویسی کے ساتھ ساتھ افسانوی تحریر ("ایسا بھی ہوتا ہے") کی موجودگی بتاتی ہے کہ خان محض رپورٹر نہیں بلکہ تخلیقی ادیب بھی تھا (مگر ہتہ نہین اس نے یہ شعبہ کیون ترک کر دیا،) مجموعی طور پر ان کا مزاج ایک مصلحانہ (Reformist)، محبِ وطن اور اعتدال پسند مذہبی ذہن کا عکاس ہے وہ نظامِ حکومت، تعلیم اور معاشرت میں خرابیوں کی نشاندہی کو اپنا فرض سمجھتے ہیں، مگر لہجہ اشتعال انگیز نہیں بلکہ اصلاحی اور تجویزی ہے۔• عوام دوست رویہ نمایاں ہے— بسوں کے مسافر، عام ملازمین، طلبہ اور کم آمدنی والے طبقے کے مسائل بار بار موضوع بنتے ہیں۔•
قومی نظریے اور ثقافتی تحفظ سے گہری وابستگی—بھارتی ٹی وی کے اثرات پر تشویش اور "نظریہ پاکستان" سے نوجوانوں کی وابستگی پر زور اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ نظریاتی طور پر قوم پرست (Nationalist) رجحان رکھتے ہیں۔ مذہب سے دلچسپی روایتی مگر غیر جذباتی، دلائل اور احادیث کی بنیاد پر ہے، انتہا پسندی سے خالی۔• ادارہ جاتی کرپشن اور بیوروکریسی پر بار بار تنقید ان کے اندر ایک جمہوریت پسند اور احتسابی سوچ کی نشاندہی کرتی ہے۔ تسلسل کے ساتھ کئی دہائیوں تک یکساں موضوعات پر لکھنا (تعلیم، ٹیکس، انتظامیہ) ظاہر کرتا ہے کہ یہ مسائل پاکستانی معاشرے میں دیرینہ اور حل طلب رہے، اور خان نے انہیں مستقل بنیادوں پر اجاگر کیے رکھا—یعنی ایک مستقل مزاج، ذمہ دار اور سماجی شعور رکھنے والا قلم کار
میری رائے میں۔ امان اللہ خان کی یہ تحریریں دراصل پاکستان کی سماجی، تعلیمی اور سیاسی تاریخ کا ایک زندہ آئینہ ہیں۔ ان کا قلم اصلاح پسند، حقیقت نگار اور نظریاتی طور پر پاکستان سے گہری وابستگی رکھنے والا ہے۔ وہ نہ تو خالص مذہبی مبلغ ہیں، نہ سیاسی نعرے باز، بلکہ ایک متوازن، سماجی طور پر بیدار اور تحقیقی ذہن رکھنے والے لکھاری کے طور پر سامنے آتے ہیں، جن کی تحریروں کا محور ہمیشہ عام آدمی، تعلیم اور قومی سالمیت رہا۔
پنجاب حکومت مین شاید ہی کوئی ایسا عہدہ ہو جد پر اس نے کام نہین کیا۔ ایگزیکٹو مجسٹریٹ۔ دفعہ 30 جوڈیشل مجسٹریٹ اسسٹنٹ کمشنر۔ کوآپریٹو ڈیپارٹمنٹ آنٹی کرپشن۔ ڈی سی او ایم ڈی ہیلتھ۔ پراجیکٹ ڈائریکٹر ۔ پھر بطور سیکرٹری ریٹائرمنت اور این جی او سے وابستگی۔۔ یہ 1975 مین جتنا متحرک تھا۔ اتنا اج بھی ہے۔ بے داغ کیریئر اس کی ایسی صفت ہے جس پر ہم تمام دوستوں کو فخر ہے۔۔ میں صاحب فراش ہونے کی وجہ سے گاؤں مین رہتا ہوں۔ مگر یہ بندہ رابطہ نہین ٹوٹنے دیتا۔۔۔ اور

دوستوں کے درمیاں وجہ دوستی بھی ہے

۔ خدا اسے خوش رکھے

پروفیسر سید منیر حسین شاہ بخاری

رینالہ خورد۔ اوکاڑہ

11 فروری 1976

لاہور

نوائے وقت

ٹیکس چوری کے کئی پہلو ہیں

اور لوگ ادائیگی سے بچنے کے لئے انھیں مختلف مواقع پر آزماتے رہتے ہیں:

تحریر: امان اللہ خاں



ہمارے یہاں ٹیکس کو ایک "تعزیری قدم" سمجھ لیا گیا ہے۔ اگر اسے ملکی خوشحالی کا مظہر بنا دیا جائے تو کوئی بھی ادائیگی سے انکار نہیں کریگا۔

اپنے وقت پر ادائیگی میں ٹیکس چوری کے مختلف پہلوؤں سے جناب سید نصیر حسین کا مضمون پڑھا۔ اس کے متعلق عرض ذیل میں ٹیکس چوری کے ایک اور ایسے پہلو کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جس کے نتائج ملک و ملت کو بھگتنا پڑتے ہیں۔

پاکستان کی قومی آمدنی کا تقریباً ایک فی صد ٹیکسوں سے حاصل ہوتا ہے جبکہ دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں یہ شرح ۱۵ تا ۲۰ فی صد تک پائی جاتی ہے۔ اس قلیل حصے میں بھی بہت بڑی رقم خود بخود ہر سال آپ سے آپ ٹیکس دہندگان ٹیکس ادا نہیں کرتے یا اپنی آمدنی کو کسی طور پر ظاہر نہیں کرتے۔ حکومت پاکستان کے سنٹرل بورڈ آف ریونیو نے اس سال کی آمدنی کو مدنظر رکھ کر ٹیکس چوری کے خلاف ایک مہم کا آغاز کیا ہے۔ چنانچہ ایک حالیہ اعلان میں ایسے افراد کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے گوشوارے ۳۱ مارچ تک ضرور داخل کر دیں۔ ٹیکسوں کی چوری کا مسئلہ کوئی نیا نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ اس وقت سے موجود ہے جب سے ٹیکسوں کا نظام رائج ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ طریقۂ واردات میں تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں۔

ٹیکس چوری کے ماہروں بھارت والے بھی پریشان ہیں پچھلے سال انہوں نے مخالفت فروخت حکومت بند کی دھمکی سے پارٹیدہ اور ناجائز دولت کو ظاہر کرنے کے لیے ایک مہم کا آغاز کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں حکومت کو کروڑوں روپوں کی دولت کا پتہ چلا۔ اس میں ۱۵ کروڑ روپیہ نقد کی صورت میں اور تقریباً ۴۰ کروڑ روپیہ سرکاری بانڈوں کی شکل میں حاصل کیا گیا۔ مہم کے آغاز سے ستمبر تک ڈیڑھ لاکھ افراد نے اپنے انکم ٹیکس کے گوشوارے داخل کئے اور تقریباً چودہ ارب روپے کی رقم ظاہر کی۔ جس میں سات ارب روپیہ پیشہ یا آمدنی اور ساڑھے سات ارب روپیہ کاپیکیت یا الیات کی شکل میں تھا۔

بھارت کے محکمۂ ٹیکس کی طرف سے اس قسم کی مہم کا آغاز ۱۹۵۱ء اور پھر ۱۹۶۵ء میں ہوا۔ لیکن اس دفعہ توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مرتبہ ٹیکس چوروں کو سزا دینے کی سزا نہیں دی گئی تھی۔ دوسرے ٹیکس کی شرح پر وصولی کی گئی تھا یعنی افراد سے یہ نہیں پوچھا گیا تھا کہ ان کے پاس یہ دولت کب سے پڑی ہوئی ہے اور کہاں سے حاصل کی گئی تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ پوشیدہ دولت (رقم تقریباً ۱۱۹۲۲ء سے ان کے پاس تھی) کا بھی پتہ چل گیا۔ ایسا طریقہ میرے خیال میں پاکستان میں بھی سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔ ٹیکس دہندگان کو اگر یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ اس شرح پر ٹیکس دے سکتے ہیں جو اس وقت رائج تھی جب انہوں نے اس دولت کو چھپایا تھا اور اور اس کے ساتھ ہی سزا اور جرمانے کا قانون بھی ختم کر دیا جائے تو خوشگوار اثرات ظاہر ہو سکتے ہیں۔

عجائب میں جن لوگوں نے پوشیدہ دولت ظاہر کی وہ صرف سرمایہ دار اور تاجر ہی نہیں تھے بلکہ ان میں وکلاء ڈاکٹر اور سرکاری ملازمین کی قسم کے افراد بھی بڑی خاصی تعداد میں شامل تھے۔ اس لیے انہیں یہ سہولت دے دی گئی کہ وہ اپنی رقم کا پانچ فی صد ایسے سرکاری بانڈوں کی خریداری میں لگا دیں جن سے نفع ملتا ہو۔ اس سے حکومت کو دو اہم فائدے حاصل ہوئے۔

۱۔ ٹیکس سے حاصل ہونے والی آمدنی میں اضافہ۔

۲۔ بچتوں کی سکیموں کو فروغ اور سرمایے کی رسد۔

اس قسم کے اقدامات پاکستان میں بھی اچھے اثرات ڈال سکتے ہیں کیونکہ پاکستانی ڈاکٹروں اور معین کھاتا اور سرکاری افسران کی آمدنی سرمایہ داروں سے اگر زیادہ نہیں تو ایسے خیال میں کم بھی نہیں ہوتی پھر اس پر یہ بیس بھارتی حکومت کی اس مہم کی کامیابی کا اصل رازیہ تھا کہ ٹیکس دہندگان کی مجبوریوں کو سمجھا گیا تھا اور ٹیکس وصول کرنے والے محکمے کو جلاوطن جیسا رویہ ترک کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ جب یہ مہم شروع کی گئی تو عوام کا ردعمل سست تھا لیکن بعد میں آہستہ آہستہ اس میں تیزی آ گئی اور آخری دنوں میں اتنی بھیڑ ہونے لگی تھی کہ ٹیکس کے محکمہ کو رات گئے تک کام کرنا پڑتا تھا۔ بعد میں اس محکمے کو بونس بھی دیا گیا۔

اگرچہ اس سے ساری کی ساری پوشیدہ دولت حکومت کے ہاتھ نہیں آ گئی۔ پھر بھی اس کا بڑا حصہ ضرور ظاہر ہو گیا۔

ٹیکس چوری سے ماضی کے ٹیکس کی وصولی درکار ہے تو ان سے "کہاں کا ماخذ" نہ پوچھئے۔

۱۹۵۸-۵۹ء میں حکومت کی طرف سے مقرر کردہ کمیٹی میں اس بات کا اظہار کیا گیا کہ ملک میں اب بھی سوا ارب روپے کی پوشیدہ دولت موجود ہے جب کہ ایک اور کمیٹی نے اسے ۴۰ ارب بتایا۔ کمیٹی نے اندازہ لگایا کہ ملک میں تقریباً ستر ارب روپے کے پوشیدہ سرمائے سے کیسے نپٹا جائے۔

ہنگامی حالات کے تحت سمگلروں کے خلاف سخت اقدامات اٹھانے کے بعد دیکھا گیا کہ پوشیدہ دولت کی مقدار کم ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں خواہوں کی دنیا میں ایسا ہے۔ جب تک ٹیکس کی شرح زیادہ رہے گی۔ دولت چھپی رہے گی اور پوشیدہ دولت متاثر ہوتی رہے گی۔ اگر چھپی ہوئی دولت کو باہر نکالنا ہے تو شرح ٹیکس کم کرنا تمام مسائل حل ہو جائیں گے

سگریٹ نوشی — موت کا پروانہ

تحریر: احسان اللہ خان ادارہ تعلیم و تحقیق

ملک کے بیشتر علاقوں میں سگریٹ نوشی کو ایک باعث فخر عمل سمجھا جاتا ہے اور اس کے برعکس انکار کرنا یا اس کے خلاف آواز اٹھانا ایک ایسی قابل مذمت بات ہے جو کہ دوسروں کو ناگوار گزرتی ہے۔ دنیا میں لوگوں کی کثیر تعداد کا مشغلہ بنا ہوا ہے۔ ہاں بڑے بڑے کئی افراد ہیں جو سمجھتے ہوئے بھی کہ یہ ایک خطرناک عادت ہے۔ اسے ترک نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے بچوں کے بچوں اور ہمدردوں کے پیچھے سے وابستہ افراد کی اکثریت اپنے ارادے کی کمزوری کرتے وقت سگریٹ کے کش لگا رہی ہوتی ہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ تمباکو نوشی کی ابتداء کہاں سے ہوئی۔ اور اس کی کاشت کس ملک میں کی گئی۔ تاہم یورپ والوں کا کہنا ہے کہ شمالی امریکہ والوں سے ملا۔ یورپ کے بعض ملک میں اس کی کاشت ۱۵۵۹ء میں شروع ہوئی جب کہ انگلستان میں تمباکو ۱۵۷۶ء میں پہنچا۔ گو اہل امریکہ بھی دوسروں سے نہیں پیچھے رہے کیونکہ تمباکو کے ان سب سے پہلے پودے "سینٹ کٹس" کہاں سے آئے۔ برصغیر پاک و ہند میں ۱۶ ویں صدی کے اواخر میں تمباکو متعارف ہوا۔ پاکستان کے مختلف علاقوں کے کچھ کا حصہ ہیں۔ حقے کے بغیر حقہ کا رواج ہمارا اور اس بات پر تمام لوگ متفق ہیں کہ سگریٹ یا سگار نوشی کا سلسلہ بیسویں صدی کے آغاز اور میں شروع ہو چکا تھا۔ سگار کی ایجاد کا سہرا بھی جنوبی امریکہ والوں کے سر ہے۔ سگار کے لئے تمباکو کا اقتدار ۱۷۵۰ء میں شروع ہوا اور اس کا پہلا کارخانہ ہوانا کے مقام پر ۱۸۱۵ء میں قائم کیا گیا۔ آخر یہ سگریٹ سگار کے بعد

ہر سال تمباکو کی فصل پر ایک بہت بڑی رقم خرچ کیا جاتا ہے۔ ایک غریب ملک کے لئے علاوہ قیمتی زرمبادلہ کے اس کا ضیاع بھی ناقابل برداشت ہے۔ ہمارے ملک میں ۱۹۷۰ء میں تمباکو کی پیداوار ۱۱۲۲۵۰ ٹن تھی۔ جس کی مالیت ۱۲۴۷۵۰ روپے تھی۔ اس کے علاوہ ۱۰۵۰ ٹن سگار اور ۱۰۵۰ ٹن سگریٹ بنائے گئے۔ جن کی مالیت ۱۲۱۲۱۳ روپے تھی۔ اس کے علاوہ ۱۲۵۸۸۰۲ روپے کا تمباکو برآمد کیا گیا۔ اس طرح ۱۹۷۰ء میں تمباکو کی مجموعی پیداوار ۱۳۸۸۰۲ روپے تھی۔ اس کے علاوہ ۱۲۵۸۸۰۲ روپے کا تمباکو برآمد کیا گیا۔ اس طرح ۱۹۷۰ء میں تمباکو کی مجموعی پیداوار ۱۳۸۸۰۲ روپے تھی۔ اس کے علاوہ ۱۲۵۸۸۰۲ روپے کا تمباکو برآمد کیا گیا۔

اس وقت دنیا میں ہر سال تمباکو کے استعمال پر ۲۰ ارب ڈالر خرچ کئے جاتے ہیں اور سگریٹ سازی کی صنعت دنیا کی بڑی بڑی صنعتوں میں ہوتی ہے اور ہر اس صنعت میں پیدا ہونے والے ۱۹۷۰ء کے مقابلے میں ۱۹۷۱ء میں امریکہ میں سگریٹوں کی پیداوار میں ۲ فیصد کا اضافہ ہوا جب کہ دوسرے ممالک میں اضافے کی مقدار یہ رہی۔

آسٹریلیا	۱۰۰۲۵۸۱
جاپان	۱۰۰۲۴۷۵
انڈیا	۲۰۳۶۰۲
روس	۲۲۵۰۰۰
پولینڈ	۱۳۸۸۰۲
جاپان	۱۲۱۲۱۳
ترکی	۱۲۴۷۵۰۲
پاکستان	۱۱۲۲۵۰

اس وقت دنیا میں سگریٹ نوشی پر جتنی رقم خرچ کی جاتی ہے اس کا ۱/۱۰ حصہ بھی اگر تعلیم پر خرچ کیا جائے تو دنیا سے جہالت کا خاتمہ ہو جائے۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۷۰ء میں دنیا میں ۱۰۰ ارب سگریٹ تیار ہوئے اور ۱۹۷۱ء میں ۱۰۲ ارب سگریٹ تیار ہوئے اور یہ تعداد سمندر سے کہیں کم ہے کیونکہ سگریٹ کے دلدادہ لوگوں میں عام استعمال پر کافی یا بدیاں عائد ہوتی ہیں۔

سگریٹ نوشی کے اتنے مضر اثرات کو مد نظر رکھتے ہوئے دنیا کے تمام ممالک اس کے استعمال کو روکنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ میں ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات سے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ وہ سگریٹ نہ خریدیں۔

سگریٹ صحت کے دشمن ہیں۔

پاکستان میں ریلوے بسوں، سینما گھروں اور تعلیمی اداروں میں سب سے زیادہ سگریٹ نوشی ہوتی ہے

سگریٹ نوشی کے اثرات کو ہر شخص جانتا ہے اور اخبارات، رسائل، ریڈیو، ٹی وی، سینما گھروں میں سگریٹ نوشی کی تشہیر پر کسی نہ کسی پابندی کا ہونا ضروری ہے۔

سگریٹ بنانے والی کمپنیوں کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ سگریٹ کے ہر پیکٹ پر سرخ رنگ سے لفظ "زہر" لکھیں اور اس میں شامل نکوٹین کی مقدار بھی درج کریں اس سے لوگوں پر نفسیاتی اثر پڑے گا اور وہ سگریٹ پینے

وقت کچھ نہ کچھ ضرور سوچیں گے۔

دفاتر، بسوں، سڑکوں اور کئی دفاتر، عجائب گھروں، تعلیمی اداروں اور پبلک مقامات پر سگریٹ نوشی پر پابندی عائد کی جائے اور سزا کی سزا بھی اس کے مرتکب افراد کو سزائیں دی جائیں۔

دفاتر، اجتماع کو سگریٹ نوشی کے خلاف ایک بھرپور آغاز کرنا چاہئے اور وزارت صحت کے تحت ایک آگہی برائے سگریٹ نوشی کی تشہیر کی جائے۔

سگریٹوں پر بھاری ٹیکس عائد کئے جائیں۔

طلبہ، اساتذہ اور دیگر متعلقین کو ایک مہم کا آغاز کرنا چاہئے اور گھر گھر جا کر لوگوں کو اس کے مضر اثرات سے آگہی کرنا چاہئے۔

اخبارات، رسائل، ریڈیو، ٹی وی، سینما گھروں میں سگریٹ نوشی کی تشہیر پر کسی نہ کسی پابندی کا ہونا ضروری ہے۔

ہمارے ملک میں ۱۹۷۰ء میں ۱۰۰ ارب سگریٹ تیار ہوئے اور ۱۹۷۱ء میں ۱۰۲ ارب سگریٹ تیار ہوئے اور یہ تعداد سمندر سے کہیں کم ہے کیونکہ سگریٹ کے دلدادہ لوگوں میں عام استعمال پر کافی یا بدیاں عائد ہوتی ہیں۔

اس وقت دنیا میں ہر سال تمباکو کے استعمال پر ۲۰ ارب ڈالر خرچ کئے جاتے ہیں اور سگریٹ سازی کی صنعت دنیا کی بڑی بڑی صنعتوں میں ہوتی ہے اور ہر اس صنعت میں پیدا ہونے والے ۱۹۷۰ء کے مقابلے میں ۱۹۷۱ء میں امریکہ میں سگریٹوں کی پیداوار میں ۲ فیصد کا اضافہ ہوا جب کہ دوسرے ممالک میں اضافے کی مقدار یہ رہی۔

آسٹریلیا	۱۰۰۲۵۸۱
جاپان	۱۰۰۲۴۷۵
انڈیا	۲۰۳۶۰۲
روس	۲۲۵۰۰۰
پولینڈ	۱۳۸۸۰۲
جاپان	۱۲۱۲۱۳
ترکی	۱۲۴۷۵۰۲
پاکستان	۱۱۲۲۵۰

اس وقت دنیا میں سگریٹ نوشی پر جتنی رقم خرچ کی جاتی ہے اس کا ۱/۱۰ حصہ بھی اگر تعلیم پر خرچ کیا جائے تو دنیا سے جہالت کا خاتمہ ہو جائے۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۷۰ء میں دنیا میں ۱۰۰ ارب سگریٹ تیار ہوئے اور ۱۹۷۱ء میں ۱۰۲ ارب سگریٹ تیار ہوئے اور یہ تعداد سمندر سے کہیں کم ہے کیونکہ سگریٹ کے دلدادہ لوگوں میں عام استعمال پر کافی یا بدیاں عائد ہوتی ہیں۔

اس وقت دنیا میں ہر سال تمباکو کے استعمال پر ۲۰ ارب ڈالر خرچ کئے جاتے ہیں اور سگریٹ سازی کی صنعت دنیا کی بڑی بڑی صنعتوں میں ہوتی ہے اور ہر اس صنعت میں پیدا ہونے والے ۱۹۷۰ء کے مقابلے میں ۱۹۷۱ء میں امریکہ میں سگریٹوں کی پیداوار میں ۲ فیصد کا اضافہ ہوا جب کہ دوسرے ممالک میں اضافے کی مقدار یہ رہی۔

آسٹریلیا	۱۰۰۲۵۸۱
جاپان	۱۰۰۲۴۷۵
انڈیا	۲۰۳۶۰۲
روس	۲۲۵۰۰۰
پولینڈ	۱۳۸۸۰۲
جاپان	۱۲۱۲۱۳
ترکی	۱۲۴۷۵۰۲
پاکستان	۱۱۲۲۵۰

اس وقت دنیا میں سگریٹ نوشی پر جتنی رقم خرچ کی جاتی ہے اس کا ۱/۱۰ حصہ بھی اگر تعلیم پر خرچ کیا جائے تو دنیا سے جہالت کا خاتمہ ہو جائے۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۷۰ء میں دنیا میں ۱۰۰ ارب سگریٹ تیار ہوئے اور ۱۹۷۱ء میں ۱۰۲ ارب سگریٹ تیار ہوئے اور یہ تعداد سمندر سے کہیں کم ہے کیونکہ سگریٹ کے دلدادہ لوگوں میں عام استعمال پر کافی یا بدیاں عائد ہوتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

تعلیمی و تحقیقی دنیا کا پیشہ ورانہ مجلہ

تعلیم و تحقیق

(افسانہ)

ایسا بھی ہوتا ہے

امان اللہ خان متعلم۔ ایم۔ اے ایجوکیشن

جون کا مہینہ تھا۔ شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ خالد یونیورسٹی سے آکر سیدھا عالیہ کے یہاں چلا آیا۔ عالیہ کی ماں گھر پر موجود نہ تھی۔ شاید وہ پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ عالیہ اپنے کمرے میں میز کے قریب بیٹھی ہوئی اپنی مکمل کی ہوئی تصویر کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کے نرم و نازک سفید عارض پر ہلکی ہلکی سرخی چھائی ہوئی تھی۔ کشادہ پیشانی پر گرمی کی تاب نہ لانے سے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نکل آئی تھیں۔ ستواں ناک کے نیچے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ ملے ہوئے تھے۔ آنچل سرک کر کاندھے پر رُک گیا تھا۔ ہوا کے بے باک جھونکوں نے بالوں کو پیشانی پر بکھیر دیا تھا۔ اور وہ آوارہ پتے کی طرح جھوم رہے تھے۔

خالد اُسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ کہ یکایک عالیہ کی نظر اُس پر پڑی۔ وہ مسکرائی اور بولی۔

"آیئے آیئے خالد صاحب۔ آج بے وقت کیسے آنا ہوا؟" اور سر پر آنچل درست کر کے پینٹنگ کے سامان کو سمیٹنے لگی۔

"میں خود نہیں آیا ہوں۔ کسی کی یاد تڑپا کر لے آئی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"اچھا جی..... گویا آپ کسی کی یاد میں تڑپتے بھی ہیں۔"

"چہ..... چہ....." وہ افسوس ظاہر کرتے ہوئے بولی

"ہاں! اگر کوئی سمجھ سکے تب؟" اس بار اُس کے بولنے کا انداز بہت جذباتی تھا۔

"آپ کسے سمجھانا چاہتے ہیں۔ اور ہاں..... یہاں تو کوئی نہیں جو آپ کی تڑپ دیکھ سکے۔" وہ شوخی سے بولی۔

"کسی کا اشارہ تو ملے۔ میں اُسے ڈھونڈ ہی لوں گا" خالد اُس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

ہوں..... کہہ کر عالیہ خاموش ہو گئی۔ دم بھر میں اُس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی چھا گئی۔ خالد کو آج عالیہ کچھ بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ روز کی طرح خواہ مخواہ ہنسنے والی اُسے چھیڑنے والی اور ذرا ذرا سی بات میں جھڑپ لینے والی عالیہ آج کچھ اور ہی دکھائی دے رہی تھی۔

اُسے وہ دن یاد آ گیا۔

جب وہ نیا نیا داخلہ لے کر یونیورسٹی میں آیا تھا۔ اور عالیہ کا سہارا اُسے نصیب ہوا تھا۔ اتنے سارے لڑکوں کے بیچ وہ خود کو اکیلا محسوس کرتا۔ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا۔ ہوسٹل سے لے کر ڈیپارٹمنٹ تک تمام لڑکے اُس کے لیے اجنبی تھے۔ ملنے جلنے والے لڑکوں سے وہ ہمیشہ کتراتا تھا۔ وہ خاموشی سے کلاس ختم کرتا اور اپنے کمرے میں آکر پڑا رہتا۔ سپورٹس اور گیمز سے اُسے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ وہ بدصورت تھا۔ بلکہ وہ کلاسیکل ٹائپ کا قبول صورت نوجوان تھا۔ رنگ صاف اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ اُسے یونیورسٹی کی

انی فضا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ عام لڑکے اور لڑکیاں اُسے "خبطی" سمجھتے اور یہی وجہ تھی کہ وہ آج تک کسی لڑکے یا لڑکی کا دوست نہ بن سکا تھا۔ اُسے نہ تو تفریحی قہقہوں پر ہونٹ کی ضرورت ہوتی۔ اور نہ فقرہ چست کرنے والے لڑکوں سے اُلجھتا۔ وہ ڈیپارٹمنٹ میں کسی سے بات کیا کرتا تھا تو وہ پروفیسر منیر تھے۔ وہ گھنٹوں اُن سے بحث کرتا رہتا تھا۔ ایک دن وہ تنہائی سے اُکتا کر چہل قدمی کے لیے نکل پڑا۔ شام کا وقت تھا۔ نیلے آسمان پر بادل کے سفید سفید ٹکڑے بکھرے ہوئے ٹھیک جھیل کی پرسکون سطح پر سفید کنول کی طرح تیرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اُسے مچل مچل کر چھیڑ رہی تھی۔

ڈبّو ... ڈبّو... کسی کو پکارتی ہوئی نسوانی آواز نے اُس کی نگاہوں کو کھینچ لیا۔ اور وہ اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔

وہ ایک لڑکی ہی تھی۔ اُس کے کھڑے ہونے کا انداز اُس سے کم حسین نہ تھا۔ اُس کے پیر کے قریب ایک چھوٹا سا کتا تھا۔ خالد کو یوں بے باکی سے دیکھتا پا کر وہ اندر چلی گئی۔

فاصلہ ہونے کی وجہ سے وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ لڑکی جھلا کر اندر گئی ہے۔ جب اُسے یہ خیال آیا کہ یہ نازیبا حرکت تھی کچھ بھی ہو وہ ایک لڑکی تھی۔ اس گری ہوئی حرکت پر وہ افسوس و ملامت کرتا ہوا آگے بڑھا ہی تھا کہ اُسے پکارتی ہوئی ایک مردانہ آواز آئی۔

اَرے خالد... یہاں کہاں؟ ادھر آؤ۔ اِس دروازے پر پروفیسر منیر کھڑے تھے جہاں کچھ ہی دیر قبل ایک چاند طلوع ہو کر غروب ہو گیا تھا۔ وہ اُن کے قریب چلا آیا۔ پروفیسر منیر نے خوش اسلوبی سے کہا۔

"خالد بیٹے! تم سے ملے تقریباً ایک ہفتہ ہو گیا۔"

"جی ہاں اِدھر پڑھائی میں مشغول رہا۔ ملاقات نہ ہو سکی۔" وہ لجاجت سے بولا۔ باتیں کرتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ پروفیسر صاحب کسی کو آواز دینے لگے۔

شہزادی بیٹی... شہزادی بیٹی..... جی آئی۔ وہی کتے کو پکارنے والی نسوانی آواز سنائی دی۔ اور وہ بلا جھجک اندر آ گئی آنکھیں ملتے ہی اُس کے خوبصورت چہرے پر جھجک نمودار ہوئی۔ اور غائب ہو گئی۔ بیٹی خالد کے لیے چائے بنا لاؤ۔" پروفیسر صاحب نے کہا۔

"مگر میں تو ابھی چائے پی کر نکلا ہوں۔" وہ بات کاٹ کر بولا۔

"تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک کپ اور سہی۔" پروفیسر صاحب کے بولنے سے قبل وہ بول پڑی۔

ہاں ہاں خالد۔ بیٹی ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ کم سے کم میرے ہاں سے ایک کپ چائے پی ہی لو۔

"جی... جی ہاں... جیسے آپ لوگوں کی خواہش۔" وہ خاموش ہو گیا۔

یہ میری لڑکی عالیہ شہزادی ہے۔ فائن آرٹس میں ایم۔ اے کر چکی ہے۔ اور بہت اچھی مصوّرہ بھی ہے۔ نمائش میں انعام بھی پا چکی ہے وہ عالیہ کی تعریف کرتے ہوئے بولے۔ اور پھر عالیہ کو مخاطب کر کے باقاعدہ تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ میں مسٹر خالد محمود۔ جیالوجی میں ایم۔ ایس۔ سی کر رہے ہیں اور اُردو ادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔"

تسلیم۔ عالیہ نے اپنی مخروطی اُنگلیوں سمیت مرمریں ہاتھ اُٹھا کر ایک ناقابلِ فراموش ادا کے ساتھ کہا۔

"تسلیم۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اور یہ جان کر مسرت ہوئی کہ آپ ایک اچھی مصوّرہ بھی ہیں۔" وہ گڑگڑا کر جلدی جلدی رٹے رٹائے جملے کو بول گیا۔

"مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی۔ کہ آپ سائنس کے طالبِ علم ہوتے ہوئے بھی اَدب کے دلدادہ ہیں۔ وہ قدرے رُک رُک کر بولی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ کو Show کر رہی ہو۔ وہ اندر چلی گئی۔

خالد لڑکیوں سے گفتگو کرنے میں گھبراہٹ محسوس کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چند منٹ کی گفتگو میں اُس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ وہ کئی بار رومال سے اپنے چہرے کو خشک کر چکا تھا۔

عالیہ جمپر اور شلوار میں ملبوس تھی۔ اور سیاہ جمپر میں اُس کا

رنگ کھو گیا تھا۔ ململ کی باریک اوڑھنی سینے پر بادل کے ٹیرتے ہوئے ٹکڑے کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔

گورا رنگ اور چھریرا بدن، حسین لمبی لمبی پلکیں، گھنی گھنی بل کھاتی سیاہ زلفیں لہرا رہی تھیں، گویا وہ مجسم شاعری فیض اور جگر کے رومانی شعروں کا مجموعہ پیش کر رہی تھی۔

اس بار وہ چائے لے کر آئی تھی۔ وہ چائے بنا رہی تھی۔ چوڑیاں کھنک رہی تھیں اور ماحول میں موسیقی کی لہریں دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو کر گونج رہی تھیں۔ "چائے پیجئے"۔ وہ اُس کی طرف کپ بڑھاتے ہوئے بولی۔

شکریہ ... چائے کے بعد وہ پروفیسر منیر سے گفتگو کرنے کے بعد چلا گیا۔ لیکن عالیہ کی تصویر اُس کے دل پر ان مٹ نقوش کی طرح اُبھر آئی تھی۔ اُس روز سے اُس کی ملاقاتیں منیر صاحب سے زیادہ ہونے لگیں اور ساتھ ساتھ عالیہ سے بھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں عالیہ اور خالد بے تکلف ہو گئے۔ دونوں کے بیچ حجاب کی دیواریں حائل نہیں تھیں اور نہ خالد کو عالیہ کے یہاں جانے میں جھجک محسوس ہوتی تھی۔ اس کا دل جذبات سے عاری نہ تھا۔ اُس کے دل میں بھی جذبات مچلتے تھے اور وہ سوچتا۔ دل سے پوچھتا۔ کیا عالیہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے؟ مگر دل جواب دینے کی بجائے زور زور سے دھڑکنے لگتا۔

کہاں کھو گئے خالد صاحب! عالیہ کی مترنم آواز نے اُس کے منتشر خیالات کو چونکا دیا۔

جی کہیں نہیں ... کچھ نہیں۔ وہ ہچکچایا۔

کچھ تو ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی

ہاں عالیہ! کچھ ہے۔ وہ بولا۔ میں کسی سے محبت کرتا ہوں۔ میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔ کسی کی مخمور و حسین آنکھوں نے مجھ پر جادو کر ڈالا ہے اس کے تفوق کے قہقہے اور دلربا مسکراہٹ نے میرے دل پر ہزاروں نشتر لگا دیے ہیں۔ دل بے شمار زخموں سے بھر گیا ہے۔

جس طرح تم تصویر بنا کر مختلف زاویوں سے دیکھتی ہو میں بھی راتوں میں اُس کی تصویر کو دیکھتا ہوں۔ وہ میرے دل کی دھڑکن ہے عالیہ میں اُسے پوجتا ہوں۔ جانے کیوں مجھے بے قرار کر کے وہ اندھیرے میں غائب ہو جاتی ہے۔ اب میں برداشت نہ کر سکوں گا۔ اُسے میری محبت قبول کرنا ہو گی۔

جانتی ہو وہ کون ہے؟ خالد اتنا کہہ کر بوجھل پڑ گیا۔ اور عالیہ کی طرف دیکھنے لگا۔ جو سر جھکائے بدستور بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے سر اُٹھا کر خالد کی طرف دیکھا اور مجسم سوال بن کر بولی، کون ہے وہ؟

"عالیہ"

خالد صاحب! وہ جیسے چیخ پڑی۔ دیوار پر ٹنگی تصویریں جیسے لرز گئیں۔ لمحہ بھر کو قائد بابا کی تصویر بھی لرز اُٹھی۔

میں آپ کو اتنا گرا ہوا اور بُرے خیالات کا انسان نہ سمجھتی تھی۔ میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ شاید آپ نے کوئی افسانہ لکھا ہے۔ جس کا کچھ حصہ سنا رہے ہیں یا مذاق کر رہے ہیں۔ آخر آپ بھی تو مرد ہی کی جنس ہیں عورت کی ذرا سی لفٹ دینے پر سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ میں تو آپ کو شریف سمجھتی تھی۔ آپ مجھے بھائی کی طرح عزیز تھے۔ میں یہ غم بھلا بیٹھی تھی کہ جوانی میں میرا کوئی بھائی مر گیا تھا۔ میں کسی کو بھائی کہنے کو ترستی تھی۔ لیکن آہ ..... آپ نے تو کچھ اور ہی سمجھ لیا۔

چلے جائیے خدا کے لیے چلے جائیے۔ میں آپ کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی ہوں۔ آپ انسان کے روپ میں شیطان ہیں۔ معصوم لڑکیوں کی زندگی آپ جیسے لوگ ہی برباد کرتے ہیں۔ اور اُسے در در کی ٹھوکریں کھانے پر آپ جیسے ہی لوگ مجبور کرتے ہیں۔ عورت شرم و حیا کی پتلی ہوتی ہے۔ اُسے کوٹھے پر بیٹھنے پر آپ مجبور کرتے ہیں۔ مریم کی پاکیزگی کی قسم کھا کر سماج کے طعنے سننے پر یا اُسے خودکشی کرنے پر آپ مجبور کرتے ہیں۔

جائیے آج کے بعد یہاں آنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔

یہ کہہ کر وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ خالد حیران کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ اُسے یقین نہ آ رہا تھا کہ پل بھر میں

...ان کا محل گر کر چکنا چور بھی ہو سکتا ہے۔

"محبت کا خواب دکھانے والی اتنی جلدی بدل بھی سکتی ہے!"

"تھرتھراتے قہقہے بکھیرنے والی کڑوی باتیں بھی کہہ سکتی ہے!"

ہاں وہ سب کچھ کہہ سکتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک عورت ہے دماغ نے کہا۔

عورت جو ہمیشہ نیا روپ لیتی ہے۔ مامتا سے بھری ہوئی ماں کے روپ میں اٹھاہ محبت کرنے والی بہن کے روپ میں۔ پرخلوص محبت کرنے والی بیٹی کے روپ میں محبت و اطاعت میں خود کو مٹا دینے والی بیوی کے روپ میں کسی کے ارمانوں کو خاکستر کرنے والی بے وفا محبوبہ کے روپ میں۔ اور وہ تو ایک فنکارہ ہے عورت نہیں بول رہی ہے بلکہ اُس کے اندر کا فن بول گیا۔ اور اُس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

دماغ کے رگ و پے سے مختلف آوازیں ہم آہنگ ہو کر ٹکرا رہی تھیں۔ اور وہ دورِ افق کی طرف تکے جا رہا تھا۔

عبدالرشید قاضی
متعلم ایم۔ اے ایجوکیشن

چمن زارِ نظر

ایک روز رسول اللہ، حضرت علیؓ کے ہاں تشریف فرما تھے اصحابِ ثلاثہ بھی حاضرِ خدمت تھے۔ حضرت علیؓ نے ایک صاف اور روشن طشت میں نہایت اعلیٰ درجے کا شہد حضورِ اقدسؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ شہد میں ایک بال بھی تھا۔ حضورؐ نے بال دیکھ کر فرمایا۔

یہ طشت، شہد اور اس میں نظر آنے والا بال بعض اسرار و معارف کے آئینہ دار ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ اسرار و معارف کیا ہیں۔

- حضرت ابوبکرؓ! مومن کا دل اس طشت سے زیادہ درخشاں ہے۔ اس کا ایمان شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ اور اس ایمان کو آخر دم تک لے جانا بال سے زیادہ باریک کام ہے۔
- حضرت عمرؓ! بادشاہت اس طشت سے زیادہ روشن ہے حکمرانی شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔ اور عدل و انصاف بال سے زیادہ باریک ہے
- حضرت علیؓ! مہمان طشت سے زیادہ روشن ہے۔ مہمان کی خدمت شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔ مگر مہمان کی خوشنودی و دلنوازی کا حصول بال سے زیادہ باریک ہے۔
- حضرت عثمانؓ! علم دین اس طشت سے زیادہ روشن ہے اس کا پڑھنا شہد سے بھی شیریں ہے۔ مگر اس پر عمل بال سے زیادہ باریک معاملہ ہے۔
- بیٹی فاطمہؓ! تم نے کچھ نہیں کہا؟ حضورؐ نے فرمایا

اے اللہ کے رسولؐ، فاطمہؓ نے جواب دیا "عورت کی حیا اس طشت سے زیادہ منور ہے۔ اس کے چہرے پر نقاب اور چادر شہد سے بڑھ کر شیریں ہے۔ اور نگاہِ نامحرم سے بچنا بال سے باریک تر ہے"

پھر حضورؐ گویا ہوئے! معرفتِ الٰہی اس طشت سے زیادہ منور ہے۔ معرفتِ آگہی اس شہد سے شیریں تر ہے۔ مگر اسے اپنے دل میں رکھنا بال سے باریک تر ہے۔

حضرت جبریلؑ حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ! راہِ خدا اس طشت سے زیادہ منور ہے۔ اس پر چلنا اس شہد سے بڑھ کر لذت بخش ہے مگر اس پر آخری دم تک قائم رہنا بال سے باریک تر ہے۔

پھر حضورؐ اکرم پر وحی نازل ہوئی، ارشاد ہوا: بہشت اس طشت سے زیادہ صاف و روشن ہے، جنت کی نعمتیں شہد سے بڑھ کر شیریں اور جنت کو جانے والا راستہ بال سے باریک تر ہے

(کنز المعارف۔ علامہ قسطلانی)

وفاق
۶ اپریل ۱۹۷۷ء

تعلیمی ادارے

تمام طلبا تنظیمیں حکومت سے تعلیمی ادارے کھولنے کا مطالبہ کر چکی ہیں اور انہوں نے اس بات کی ضمانت بھی دی ہے کہ وہ تعلیمی اداروں میں خود امن و امان قائم رکھیں گی۔

از: امانت اللہ خاں سیتر نائب صدر سٹوڈنٹس یونین ادارہ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب

تمام تعلیمی ادارے غیر معینہ مدت کے لئے بند کر دیئے گئے ہیں۔ یہ وہ فیصلہ تھا جس نے جناب محمود کو پریشان کر دیا۔ یہ تعلیمی ادارے بلکہ ان کی مساعی پر اصلاحی شکل کی مزاحمتی اور انگلش میڈیم کے قیام کے لئے وزیر تعلیم سے ہونے والی ملاقاتیں ختم ہو گئیں۔ وزیر تعلیم کا یہ فیصلہ ان کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا کہ انکشن ختم ہوتے ہی تعلیمی ادارے کھول دیئے جاتے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ حکومت اور اپوزیشن کے اتحاد میں اتحاد کی تاریخ کے سلسلے میں متفقہ فیصلہ ہو گیا۔ جیسے نے آہستہ آہستہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ جس میں تحریک التوا کی مجلس عاملہ کی جانب سے وقت تعلیمی ادارے کھلنے کے آثار نظر نہ آتے دکھائی دیتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کو بند کرنے کا جواز جیسا کہ وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی تقریر میں بتایا ہے کہ بعض سیاسی طلبہ کو اپنا آلہ کار بنا کر انہیں ملکی تخریب کاری اور اپوزیشن جماعت کو اچھالنے تھے۔ میرے خیال میں یہ فیصلہ جس کی بازگشت تعلیمی اداروں میں سنائی دے رہی ہے بالکل غلط ہے۔

جس وقت تعلیمی ادارے بند ہوئے اس وقت یہ کیفیت تھی کہ کالجوں ہوسٹلز اور یونیورسٹی کے بہت سے امتحانات کی ڈیٹ شیٹس کا اعلان ہو چکا تھا۔ اور طلبہ اپنے اپنے امتحانات کی تیاری میں مصروف ہو گئے تھے۔ اب اگر تعلیمی ادارے کھول دیئے جائیں تو طلبہ پھر اپنے امتحانات کی تیاریوں میں مصروف ہو جائیں گے۔ اور امتحان کے زمانے تک ہوٹل جاتے ہیں وہ جا کر اپنے کھانے کے اوقات تک ہوٹل جاتے ہیں وہ جا کر وہ تحریک کو ختم کر دیں گے۔

پھر اگر طلبہ نے کوئی تحریک چلانا تھا تو وہ اب تک کر چکے ہوتے کیونکہ وہ ہوسٹل کے طلبہ وہ ہوتے ہیں اور کراچی اور شہر سے طلبہ کہیں تک سے باہر نہیں چلے گئے طلبہ کیلئے ہر کر ملک اس وقت تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہا ہے اور اس کو اس بحران سے نکالنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ عرب امارات اور عرب امداد باہمی کی گفت و شنید سے ہمیشہ کے لئے کسی حل پر پہنچیں۔ اس نے طلبہ اس مرحلے پر خاموش نہیں رہ سکتے۔ دوسرے حکومت کا یہ مفروضہ اس لئے بھی غلط ہے کہ طلبہ نے خود ہی کہا ہے کہ وہ تعلیمی اداروں میں خود امن و امان قائم رکھیں گی۔

حکومت کو طلبہ پر اعتماد کرنا چاہئے۔ طلبہ تنظیمیں یقیناً امن و سلامتی کا تحفظ کر سکتی ہیں۔ اس کی تازہ ترین مثال پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین ہے۔ جس نے ہڑتال کے زمانے میں اس کو قائم رکھا اور ہڑتال کے خاتمے کے فوراً بعد ہی یونین کے الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اب بھی اگر وہ خواہش ہو صورت ہمیں آتی ہے تو طلبہ انجمنیں اس پر خوشی سے راضی ہیں گی۔

• طلبہ کے امتحان قریب ہو رہے ہیں۔ تمام نظام امتحان انتشار کی نذر ہو چکا ہے۔ اب اگر تعلیمی ادارے کھل بھی جائیں تو طلبہ کا ذہن امتحان کی طرف ہو گا۔ اور وہ ہنگامہ آرائی کی طرف توجہ نہیں دیں گے۔

• طلبہ نے جو کورس پڑھا تھا وہ مکمل ہو چکا ہے۔ کیونکہ فروری میں ہی ان کے امتحان ہونے تھے۔ اب امتحان کی تیاری کے لئے انہیں کم از کم ایک ماہ کا عرصہ درکار ہے۔ اس لئے ان کا امتحان ملتوی ہو رہے ہیں۔ اور نئے سرے سے امتحان کی تیاری کرنا ہو گی۔

• ہڑتال کے دوران طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے اپنے کورس کی تیاری کر لی ہے۔ اب اگر ان کو امتحان کے لئے دو ماہ کا عرصہ دیا جائے تو ان کی اکثریت اس کورس کو دوبارہ تیار کرنے کی زحمت نہیں کرے گی۔ اس لئے ان کا امتحان لینا بے سود ہو گا۔

• ہڑتال کے دوران طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے اپنے کورس کی تیاری کر لی ہے۔ اب اگر ان کو امتحان کے لئے دو ماہ کا عرصہ دیا جائے تو ان کی اکثریت اس کورس کو دوبارہ تیار کرنے کی زحمت نہیں کرے گی۔ اس لئے ان کا امتحان لینا بے سود ہو گا۔

• بعض تعلیمی ادارے ایسے بھی ہیں جہاں طلبہ کی اکثریت ان سے دور ہو چکی ہے۔ مثلاً ادارۂ تعلیم و تحقیق، ایجوکیشن کالج لاہور یہ ادارے بند ہونے سے طلبہ کو اپنی تکمیل کے لئے اپنے اپنے علاقوں میں سہولتیں فراہم ہو جائیں گی۔ اب ہر طالب علم کی دوسرے تعلیمی سال کے شروع ہونے تک یہاں سے اس طلبہ کو مزید چھٹی کی ضرورت پڑے گی۔ نیز بعض کا ان کی ذہنی رو والی پریشانیوں میں اضافے کا باعث بنے گی۔

• اسی طرح امتحانات دیتے ہوئے اور پھر دیر سے نتائج نکلنے کی وجہ سے طلبہ کا خاصا قیمتی وقت ضائع ہونے کا خدشہ ہے۔ اور یہ وقت دوسرے کاموں کی طرف توجہ دینے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

• پچھلے سالوں سے پنجاب یونیورسٹی طلبہ کے یونین سازی کے حق کو اس وجہ سے اچھی خاصی اہمیت دیتی ہے۔ خدا خدا کر کے اس نے اپنی پالیسی میں تبدیلی کی ہے کہ امتحانات کا نیا طریق کار وضع کیا جائے جس موجودہ صورت حال کی روشنی میں ہر ایک سال ضائع ہونے کا خطرہ ہے اور نسب سے زیادہ نقصان اس طلبہ کو پہنچے گا جو اس سال امتحان دے رہے ہیں اور نظر کے چھبیس سال کر پہنچے ہوئے ہیں۔ نئے یونیورسٹی قوانین کے تحت انہیں اب دے سے داخلہ نہیں مل سکے گا اور دن ان کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔

• پاکستان بھر کی یونیورسٹیوں میں پچھلے سال سے سٹر



وفاق

ایم ایڈ اور ایم اے ایجوکیشن کو سترھواں گریڈ دیا جائے

احسان اللہ خان سینئر نائب صدر سٹوڈنٹس یونین

ادارہ تعلیم و تحقیق لاہور

افکارِ قارئین

اساتذہ سے کئے گئے وعدے کب پورے ہوں گے

Scanned with CamScanner



روزنامہ سیاست لاہور

ایڈیٹر اثر چوہان

لاہور اور ملتان سے بیک وقت شائع ہوتا ہے

۲۷ اکتوبر 1977

مسائل کا شکار

آئی-ای-آر

طلباء کہتے ہیں مسائل حل کیوں نہیں ہوتے

رورٹو سوات

انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کا مطالعاتی دورہ

Scanned with CamScanner

روزنامہ وفاق لاہور

تاریخ ۹ اکتوبر ۱۹۷۷

نوجوان نسل اور نظریہ پاکستان

تحریر:- امان اللہ خان ادارہ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب

ضرورت اس امر کی ہے کہ نوجوانوں کو تعلیم کے ذریعے نظریہ پاکستان سے روشناس کرایا جائے

کچھ دن ہوئے میں اپنے ایک دوست کے ہاں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ان کا پانچ چھ سالہ بچہ کمرے میں داخل ہوا۔ میرے دوست نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بچے سے کہا بیٹے! انکل سے ہاتھ نہیں ملاؤ گے۔ بچہ یک دم میری طرف گھوما اور ہاتھ جوڑ کر "انکل نمستے" کہا اور قدموں کو چھونے کے لئے آگے بڑھا مگر میں نے اسے یکدم اٹھا لیا اور اپنے دوست سے اس کا ماجرہ پوچھا۔

یار کیا بتاؤں امرتسر ٹی وی پر فلمیں دیکھ کر اس نے بھی ہندوانہ طریقے اختیار کرنا شروع کر دیئے ہیں اب مجھے بھی پتا جی اور اپنی امی کو ماتا جی کہنے لگا ہے اپنے دوست کی باتیں سن کر مجھے حیرت نہیں ہوئی یہ صرف ایک گھرانے کا مسئلہ نہیں بلکہ ہر اس گھر کا مسئلہ ہے جہاں امرتسر ٹی وی کا ہر پروگرام بلا ناغہ باجماعت دیکھا جاتا ہے۔

آج سے تیس برس پہلے جب پاکستان معرض وجود میں آیا تھا تو اس وقت ہندو لیڈروں کو یقین تھا کہ یہ پاکستان بہت جلد ختم ہو جائیگا لیکن اسلام کے نام پر قائم ہونے والی یہ مملکت قائم و دائم رہی۔ ہندو نے اسے ختم کرنے کے لئے بڑی چوٹی کا زور لگایا گیا۔ پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ قوم گولیوں اور بموں سے تباہ نہیں کی جا سکتی تو اس نے نفسیاتی جنگ شروع کر دی زندہ دلان لاہور کی سرفروشی اور بہادری اس کو ہر بار پاکستان کے دل لاہور پر حملہ کرنے سے روکتی رہی تو اس نے اس قوم کو خراب کرنے کے لئے ان کے پاک اور جوشیلے لہو میں امرت کے روپ میں زہر گھولنا شروع کر دیا امرتسر بیلی وژن سٹیشن کھول کر اس نے لاہور کی شریانوں کو پکڑ لیا پاکستان کا دل آج اپنی دھڑکنوں کی رفتار بھولتا جا رہا ہے کوئی گھرانہ ایسا ہوگا جو اس کے اثرات سے بچا ہو۔ آج نوجوان نسل پر اس کے اثرات بہت تباہ کن ثابت ہو رہے ہیں۔

نوجوان نسل اپنی اساس اسلام کو چھوڑ کر بت پرستی اور مشرکانہ عقائد میں دل کشی محسوس کر رہی ہے فلم میں ہیروئن کو بتوں کے سامنے ہاتھ جوڑتے دیکھ کر وہ بھی لاشعوری طور پر رب واحد کو بھول کر زیر لب بھگوان کی سوگند جیسے الفاظ دہراتے رہتے ہیں اور اسلام وعلیکم کی بجائے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے ہیں خود میں نے جامعہ پنجاب میں بہت سے نام نہاد ترقی پسندوں کو اسی انداز سے سلام کرتے دیکھا ہے اور منگل اور ہفتے کے دن انڈین فلم دیکھنے کے لئے ہوسٹل کے ٹی وی روم میں کرسیاں چلاتے دیکھا ہے۔

آج کی نسل رفیع اور لتا کے گانوں پر مرمٹتی ہے۔ ان کی آواز سنتے اس کے قدم آپ ہی آپ رک جاتے ہیں ان کے چہروں کے رنگ بدل جاتے ہیں اور دل کی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں آج انارکلی کے بازو کن بازار میں قدم قدم پر بھاگتی فلموں کے گانے کے ٹیپ اور ہندوستانی ایکٹروں کی تصاویر کیوں اتنی بڑی تعداد میں فروخت ہو رہی ہیں کوئی سوچے تو سہی؟

آل انڈیا ریڈیو اور ٹی وی سے فرمائشی پروگرام میں پاکستانیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے اسے بے خطوں میں کئی لوگ پاکستان اور بھارت کے ایک ہونے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے بھی پائے جاتے ہیں بڑے بڑے جرمانوں کے باوجود وی سی آر پر انڈین فلموں کی نمائش آج بھی بدستور جاری ہے اور لوگ مہنگی قیمت پر بھی اسے ضرور دیکھتے ہیں "مغل اعظم" کو دیکھنے کے لئے پورا پاکستان لاہور میں امنڈ آتا ہے گلیاں اور بازار سنسان ہو جاتے ہیں یہ ہندوستان کے پروپیگنڈے کی کامیابی نہیں تو کیا ہے؟

آج بہت سے لوگ یہ کہتے کیوں سنائی دیتے کہ پاکستان اور ہندوستان کی ثقافت، بردباری، لباس ایک ہے تو پھر انہیں ایک کیوں نہیں ہونا چاہیے۔ یہ خیال ان ذہنوں میں کس نے پیدا کیا؟ آج اسلام اور پاکستان کے دشمن قدم قدم پر اپنے ناپاک اور مذموم ارادوں کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف عمل ہیں۔

پاکستان کا ہر فلمی رسالہ ہندوستان کے فلمی اداکاروں کی تصاویر صفحہ اول پر شائع کرتا ہے پھر لاتعداد سب رنگ، جاسوسی، عمران ڈائجسٹ جیسے رسالوں میں ہندوانہ رسم و رواج اور عقائد کی براہ راست تبلیغ ہوتی ہے اور نوجوان نسل اسے شوق سے پڑھتی ہے اور راہ راست سے بھٹکتی جا رہی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو تعلیم کے ذریعے نظریہ پاکستان سے روشناس کرایا جائے اور اس کے لئے ان اساتذہ کی خدمات حاصل کی جائیں جنہوں نے نظریہ پاکستان کے لئے قربانیاں دی ہیں آج ہمارے کالجوں اور ایونیورسٹیوں میں یہ حالت ہے کہ خود پروفیسر صاحبان کو بھی علم نہیں کہ نظریہ پاکستان "کس چڑیا" کا نام ہے آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ پاکستان میں تربیت اساتذہ کے سب سے بڑے ادارے "ادارہ تعلیم و تحقیق" میں پچھلے سال ایک کورس "نظریہ پاکستان" کے نام سے شروع کیا گیا اس میں طلبہ کی خاصی تعداد نے داخلہ لیا لیکن کلاس کے پہلے دن پروفیسر صاحب نے ان کی امیدوں پر یہ کہہ پانی پھیر دیا کہ نظریہ پاکستان کے بارے میں انہیں بھی کچھ معلوم نہیں پھر جس طرح لڑکوں کو اس کورس میں پاس کیا گیا وہ اپنی جگہ ایک داستان ہے صرف چند صفحے کی اسائنمنٹ پر ہی ان کو پاس کر دیا گیا۔ پڑھائی تو ظاہر ہے کیا ہونا تھی سیکرٹری کو بھی نظریہ پاکستان کے بارے میں علم نہیں تھا۔

یہ بات اب میں اہل نظر پر چھوڑتا ہوں کہ وہ خود

باقی صفحہ ۴ پر

بقیہ:- نوجوان نسل

بتائیں کہ کون حالات میں جب کہ یونیورسٹیاں اور کالج بھی نظریہ پاکستان کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے ذرائع ابلاغ بھی نظریہ پاکستان کی کچھ خدمت نہ کر رہے ہوں دشمن کی طرف سے بھی شدید ثقافتی حملے ہو رہے ہوں تو ہمارا نوجوان کہاں جائے کس سے رہنمائی حاصل کرے وہ اپنے آپ کو ان حملوں سے کیسے بچائے یہ سب سوال اپنی جگہ ہم ہمیں اور ہم سب کو ان کا جواب تلاش کرنا ہے۔

Scanned with CamScanner

روزنامہ سیاست لاہور

مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء

ثقافتی یلغار کو روکنے کے لئے مناسب اقدامات کیے جائیں

امرتسر ٹی۔وی

معصوم ذہنوں کو پراگندہ کر رہا ہے

— اداریہ —

کچھ دنوں ہوئے میں اپنے ایک دوست کے ہاں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ان کا چھوٹا سا لڑکا بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور بڑے غصے سے میری طرف اشارہ کر کے بولا "انکل آپ نے ہمارا ٹی وی خراب کر دیا ہے"۔ میں نے اس سے کہا بیٹھے! انکل سے ایسے نہیں بولتے۔ آپ کو معافی مانگنی چاہیے۔ اس پر وہ بچہ میری طرف گھورا اور پھر ایک دم "انکل معاف کیجئے" کہہ کر اندر کی طرف بھاگا اور ٹی وی کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کہا کہ بیٹے! ٹی وی تو میں نے ٹھیک کیا ہی نہیں تھا۔ اس نے جواب دیا "انکل! آپ نے ٹھیک نہیں کیا تو کیا ہوا، آپ نے کہا تھا نا کہ آپ نے ٹھیک کیا ہے"۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے سمجھایا کہ بیٹے! جھوٹ بولنا بری بات ہے۔ اس پر وہ بچہ بولا "انکل! آپ نے ٹھیک نہیں کیا تو کیا ہوا، آپ نے کہا تھا نا کہ آپ نے ٹھیک کیا ہے"۔ میں نے اس کو

نہیں کرتے تو وہ امرتسر کی طرف سوئی
گھما دیتے ہیں۔

— اگر ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں
کو نظریہ پاکستان سے ہم آہنگ کر دیا جائے
اور ان اداروں کو انڈیا کی ثقافتی یلغار سے
مقابلے کے لئے استعمال کیا جائے تو بہت
حد تک اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ دوسری
طرف ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے
نوجوانوں کو تعلیم کے ذریعے نظریہ پاکستان
سے آگاہ کیا جائے اور اس کے لئے ان
اساتذہ کی خدمات حاصل کی جائیں جنہوں
نے نظریہ پاکستان کے لئے قربانیاں دی
ہیں اور اس کا پس منظر رکھتے ہیں۔ آج
ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یہ حالت
ہے کہ خود پروفیسر صاحبان کو بھی علم نہیں
ہوتا کہ نظریہ پاکستان کس چڑیا کا نام ہے۔
ایک چھوٹی سی مثال اہل نظر کے سامنے
پیش کرتا ہوں۔ پاکستان میں تربیت
اساتذہ کے سب سے بڑے ادارے
تعلیم و تحقیق میں پچھلے سال "نظریہ پاکستان"
کے نام سے ایک کورس متعارف کرایا گیا۔
اس میں طلباء کی خاصی تعداد نے حصہ لیا۔
لیکن کلاس کے پہلے دن پروفیسر صاحب نے
جو خیر سے ڈاکٹر بھی ہیں یہ کہہ کر ان کی
امیدوں پر پانی پھیر دیا کہ نظریہ پاکستان
کے بارے میں انہیں بھی کچھ علم نہیں۔ پھر
جس طرح اس کورس میں طلبہ کو پاس
کیا گیا وہ اپنی جگہ ایک داستان ہے۔ چند
صفحے کی اسائنمنٹ لکھ کر دینے ہی سے
طلبہ کو گریڈ دے دیئے گئے۔ پڑھائی تو
ظاہر ہے کیا ہونا تھی جبکہ پروفیسر صاحب
ہی نظریہ پاکستان کے بارے میں کورے
تھے۔ چنانچہ اس کے بعد آج تک اس
ادارے میں "نظریہ پاکستان" کا مضمون
پیش نہیں کیا گیا کیونکہ پڑھانے والے
نہیں ملتے۔

یہ بات میں اہل نظریہ پر چھوڑ دیتا
ہوں کہ وہ بتائیں کہ ان حالات میں جب
کہ یونیورسٹیاں اور کالج بھی نظریہ پاکستان
کے بارے میں کچھ نہ بتاتے ہوں۔ ذرائع
ابلاغ بھی اس کے منافی چل رہے ہوں
اندرونی اور بیرونی دشمن ملک کی نظریاتی
سرحدوں پر شدید حملے کر رہا ہو تو ہمارا
نوجوان کہاں جائے؟ کس سے رہنمائی حاصل
کرے؟ وہ کس طرح اپنے آپ کو ان حملوں
سے بچائے۔ یہ سب سوال اپنی جگہ اہم ہیں
اور ہمیں ان کا جواب دینا ہوگا۔

Scanned with CamScanner

۲۱ اکتوبر ۱۹۷۷ء

طلباء کو ٹیوشن پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے

اساتذہ کی لاپرواہی سے معیارِ تعلیم متاثر ہوتا ہے

قمر یزدان اللہ خان



جبری ٹیوشن فی الفور ختم کرائی جائے



ہماری کائنات اپنی تشکیل سے اب تک
ایک ہی سمت میں سفر کر رہی ہے

کیا گذرے ہوئے وقت کو واپس لوٹایا جا سکتا ہے؟

لمبائی، چوڑائی اور اونچائی
کی طرح وقت بھی ایک
سمت ہے لیکن اس کا
سفر محض ایک ہی رخ یعنی
مستقبل کی طرف ہے اور
اسی طرف رہے گا

دریا کے جس پانی پر آپ کی نظر پڑتی ہے آپ کے قدم اس پانی پر کسی صورت میں نہیں پڑ سکتے

تحقیق اور اسکی اہمیت

اس سے معاشرے میں موجود معاشی و سماجی مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے!

تحریر: امان اللہ خان

انسان کی سوچنے سمجھنے اور علم و دانش کی کسوٹی پر پرکھنے کی صلاحیت ہی اسے دیگر جانداروں سے ممتاز کرتی ہے کیا' کیوں' کیسے' کے معمے کو حل کرنے کے لئے بے چین فطرت کو طمانیت بخشنے کے لئے تجسس کے منہ زور اور بے لگام گھوڑے کو لگام دینے کے لئے ہی انسان کبھی صحرا نوردی کرتا ہے تو کبھی بلند و بالا چوٹیاں اپنے نام کرتا ہے اور کبھی شوق و تجسس میں سمندر کی اتھاہ گہرائیوں تک جا پہنچتا ہے..... اور..... آج اسی بے چین طبیعت کی خاطر خلاؤں کو تسخیر کر رہا ہے اس تجسس کے باعث ہی بہت سے سربستہ راز ہو کائنات کے سینے میں پوشیدہ تھے عیاں ہو کر انگشت دوام ہو گئے ہیں مختصراً یہ کہ انسان کی ہر وہ کاوش جو کسی راز کی پردہ کشائی کا موجب بنے..... تحقیق کہلاتی ہے۔

"تحقیق" کے لئے انگریزی زبان میں لفظ ریسرچ (RESEARCH) استعمال ہوتا ہے "ریسرچ"..... سرچ SEARCH سے ماخوذ ہے جس کے معنی ڈھونڈنے اور تلاش کرنے کے ہیں دراصل تحقیق غور و فکر پر مبنی ایسی شعور و آگہی کی کوشش ہے جو کسی مسئلے کے حل کے لئے شواہد جمع کرتی ہے اس سے نتائج اخذ کرتی ہے اور ایک ایسی نئی دریافت کا باعث بنتی ہے جو علم میں اضافہ کرے۔

تحقیق کے ذریعے مستقبل کی منصوبہ بندی کی جا سکتی ہے مثلاً آجکل تعلیم پر بہت زور دیا جا رہا ہے اب اس نقطہ پر سوچنا چاہئے کہ آج ہمارے ہاں تعلیمی اداروں میں کتنی گنجائش ہے اور کتنے فیصد افراد تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور کس شرح سے تعلیم حاصل کرنے والوں میں اضافہ ہو رہا ہے ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلیمی اداروں کو وسعت دی جائے تاکہ وہ مستقبل میں بھی اسی طرح آبادی کے بڑھنے کی رفتار کا جائزہ لینا کراچی کو آجکل جو مسائل درپیش ہیں اس کی ایک بڑی وجہ آبادی کا بہت تیزی سے بڑھنا ہے کراچی کی منصوبہ بندی میں آبادی کے بڑھنے کی رفتار کو مدنظر نہیں رکھا گیا تھا اور آج جس تیزی سے کراچی کی آبادی بڑھ رہی ہے اس لحاظ سے مستقبل کی منصوبہ بندی نہیں کی جا رہی ہے تحقیق ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ ہم موجودہ مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی وجوہات اور آنے والے مسائل کے لحاظ سے بہتر منصوبہ بندی کریں۔

تحقیق نئی اشیاء کی تخلیق کا سبب بنتی ہے اور تحقیق کی بدولت ہی اس کی اہمیت و افادیت دو چند ہوتی رہتی ہے مثلاً علم کو محفوظ کرنے کے لئے انسان نے پتھر' ..... 'چمڑے کا سہارا لیا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی متحرک سوچ نے پتھر سے آفسٹ پرنٹنگ تک کا سفر کیا اور اب چھپائی سے مائکرو فلم و فش وغیرہ تک پہنچ گیا ہے اسی طرح بانس اور پتوں کے گھروں سے آج کی جدید تعمیرات تک..... "انکا" سے کمپیوٹر اور اب کمپیوٹر سے مائکرو کمپیوٹر تک..... یہ سب تحقیق کا نتیجہ ہے جو انسان کی مسلسل جدوجہد کے بعد سامنے آیا ہے۔

معاشرے میں موجودہ معاشی و سماجی مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے اس ضمن میں سروے ریسرچ کے ذریعے تازہ ترین اعداد و شمار حاصل کر کے ان اعداد و شمار کی روشنی میں مسائل حل کئے جا سکتے ہیں Search Research

تحقیق لائبریری کو تازہ ترین معلومات فراہم کرتی ہے مختلف ادارے اور افراد مختلف موضوعات' عنوانات پر تحقیق میں مصروف ہوتے ہیں ان اداروں اور افراد کی تحقیق کے نتائج لائبریری حاصل کرتی ہے اور دلچسپی رکھنے والے دیگر افراد کو مہیا کرتی ہے جو اس سے متعلقہ عنوان پر کام کر رہے ہوتے ہیں۔

تحقیق غلط معلومات درست کرتی ہے مثلاً قدیم دور میں لوگ زلزلے کا سبب گائے کا سینگ بدلنا سمجھتے تھے مگر اب تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ ایسا نہیں تھا اسی طرح بڑھیا کا چاند پر چرخہ چلانا' زمین کا حرکت نہ کرنا وغیرہ۔

آج دنیا ترقی کی جس منزل پر ہے وہ تحقیق کی مرہون منت ہے خوب سے خوب تر کی تلاش نے انسان کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ گھر بیٹھے دنیا کے حالات سے باخبر رہ سکتا ہے' سٹلائٹ کے ذریعے امریکہ' یورپ میں ہونے والے کھیل' واقعات براہ راست دیکھ سکتا ہے گذرے ہوئے کل کو ویڈیو پر آئندہ کے لئے محفوظ کر سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر اس صدی کا عظیم کارنامہ کمپیوٹر جس کی آمد نے زندگی کے ہر شعبہ کو مزید پر سہولت بنا دیا ہے۔

تحقیق چند برسوں سے نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس کا آغاز انسان کی فکر کے جنم سے ہوا فکر..... مسائل کی پیداوار ہوتی ہے اور مسائل ازل سے درپیش ہیں تو گویا تحقیق کی ارتقاء کا سفر صدیوں پر محیط ہے تحقیق زندگی کو متحرک رکھتی ہے بالکل اسی طرح جیسے تلاطم سمندر کے رواں دواں رہنے کا احساس دلاتا ہے

Scanned with CamScanner

وفاق

تعلیمی ادارے

تمام طلبا تنظیمیں حکومت سے تعلیمی ادارے کھولنے کا مطالبہ کر چکی ہیں اور انہوں نے اس بات کی ضمانت بھی دی ہے کہ وہ تعلیمی اداروں میں خود امن و امان قائم رکھیں گی۔

از: امان اللہ خان سیتر نائب صدر سٹوڈنٹس یونین ادارہ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب

تمام تعلیمی ادارے فروری سے کھلنے جا رہے ہیں۔ یہ خبر جس نے بھی سنی خوش ہوا کہ چلو کچھ تو تعلیمی ادارے کھلیں گے اور ہمارے بچے کچھ تو پڑھ سکیں گے۔ اس خبر کے ساتھ ہی ایک خبر اور بھی آئی کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن کی طرف سے یونیورسٹیوں کے لئے ہدایات جاری کر دی گئی ہیں کہ امتحانات کے لئے کم از کم ۷۵ فیصد حاضری ہونا لازمی ہے۔ اس خبر نے بہت سے طلبا کو پریشان کر دیا۔ کیونکہ ان کی حاضری ۷۵ فیصد سے بہت کم تھی۔ اس خبر کے ساتھ ہی ایک اور خبر بھی آئی کہ امتحانات کی فیس بھی معاف کر دی گئی ہے۔ اس خبر نے بھی طلبا کو کافی پریشان کیا۔ کیونکہ بہت سے طلبا کی فیس ابھی تک جمع نہیں ہوئی تھی۔ اس خبر کے ساتھ ہی ایک اور خبر بھی آئی کہ امتحانات کی فیس بھی معاف کر دی گئی ہے۔ اس خبر نے بھی طلبا کو کافی پریشان کیا۔ کیونکہ بہت سے طلبا کی فیس ابھی تک جمع نہیں ہوئی تھی۔

جس وقت تعلیمی ادارے بند ہوئے اس وقت یہ کیفیت تھی کہ ایجوکیشن اور ادارے کے بہت سے امتحانات کی ڈیٹ شیٹس کا اعلان ہو چکا تھا۔ اور طلبہ اپنے اپنے امتحانات کی تیاری میں مصروف ہو گئے تھے۔ اب اگر تعلیمی ادارے کھول دیے جائیں تو یقیناً پھر اپنے امتحانات کی تیاریوں میں مصروف ہو جائیں گے۔ اور امتحان کے زمانے میں طلبا کم اپنے کھانے کے اوقات تک بھول جاتے ہیں چہ جائیکہ وہ کمرہ امتحان کے لئے سفر کی صعوبتیں برداشت کریں۔

پھر اگر طلبہ کو کرایہ ہی تھا تو وہ اب تک کر چکے ہوتے کیونکہ ہاسٹل کے طلبہ کا بوجھ بھی ہوتا ہے اور کرایہ اور اخراجات کے علاوہ کہیں ملک سے باہر نہیں چلے گئے طلبہ سمجھتے ہیں کہ ملک اس وقت تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہا ہے اور اس کو اس بحران سے نکالنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ عرب اسرائیل جنگ اتحاد باہمی طاقت و تشدد سے مسئلے کا حل ہو چک

نوائے وقت
کراچی ● لاہور ● راولپنڈی ● ملتان

تاریخ ۹ دسمبر ۱۹۸۱

اِن جوہریوں کی پہچان کون کرے؟

از: اسلم اللہ خان

المیہ یہ ہے کہ جینئس طلبا کو اسکول میں شرارتی اور نافرمان شاگردوں کی فہرست میں رکھا جاتا ہے۔

بچوں کی حوصلہ افزائی کیجیے ان کی ذہانت سے ہمارا بہتر مستقبل وابستہ ہے!

اسکولوں سے اخذ کی۔ جینئس بچے شرارتی ہوتے ہیں۔ جن وہ اپنی شرارتوں کا مرکز اپنے سے کمزور بچوں کو نہیں بناتے بلکہ ان کی شرارتیں مثبت نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ان کا تجسس ذہن کسی مسئلے کی طرف الجھتا ہے تو وہ اس ذہنی الجھاؤ کو سلجھانے کے لیے یہ بچے مختلف نوعیت کے کام کر جاتے ہیں جسے ہم "بڑے" شرارت کا نام دے دیتے ہیں۔ جیسے ایک تین سالہ بچی نے ایک ریڈیو سیٹ کو محض اس لیے توڑ ڈالا کہ بقول اس کے وہ اس کے اندر چھپے ہوئے گلوکار سے ملنا چاہتی تھی۔ اور ایک پانچ سالہ بچے نے ایک مرغی کا پیٹ اس لیے پھاڑ ڈالا کہ وہ اس کے اندر انڈوں کو بنتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی ایجاد بھاپ کا انجن بھی ایک شرارت کا نتیجہ تھا۔ کیتلی میں چائے پکتے ہوئے ڈھکن کا بار بار اٹھنا اور ننھے سائنسدان کا اس بھاپ کو روکنے کی کوشش میں کیتلی کے اوپر بیٹھنا ایک غور و فکر والے اور متجسس ذہن کی علامت تھا اور پھر اسی شریر بچے نے دنیا کو ایک اہم ایجاد "بھاپ کا انجن" سے روشناس کرایا۔

ان سب باتوں کے باوجود ہمارے ملک میں یہ دیکھا گیا ہے کہ تقریباً ۸۰ فیصد اساتذہ ایسے بچوں کے وجود سے ہی ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ ایسے بچوں کو شرارتی اور بگڑا ہوا اور بدمعاش سمجھ کر سلوک کرتے ہیں۔ حیرت تو اس بات کی ہے کہ وہ والدین کی اکثریت بھی اپنے ان بچوں کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پاتی جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ بچے عدم توجہی کے باعث اپنے ماحول سے ہٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ قدم قدم پر رکاوٹ، بات بات پر روک ٹوک سے ان کا احساس خودی مجروح ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں ان کے اندر کا "جینئس" دبنا شروع ہو جاتا ہے اور پھر ایک مقام ایسا آتا ہے کہ یہ بچے ذہنی طور پر اپنے آپ کو پامال کر لیتے ہیں اور یوں ایک گوہر نایاب مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض بچے ضدی اور ہٹ دھرم بن جاتے ہیں اور انتقاماً اپنی صلاحیتوں کو منفی سمت میں موڑ لیتے ہیں اور یوں معاشرہ ذہین مجرموں (VIGENIOUS) کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

اس لئے والدین اور اساتذہ کا فرض ہے کہ ایسے بچوں کو پہچانیں اور انہیں دوسرے بچوں سے الگ سمجھ کر ان کی تعلیم و تربیت کریں۔ پاکستان میں بھی دوسرے ممالک کی طرز پر ایسے بچوں کے لیے علیحدہ سکولنگ کا بندوبست کیا جا سکتا ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ایک ہی سکول کے مختلف سیکشن IQ کی بنیاد پر تشکیل دیے جا سکتے ہیں۔ A سیکشن جینئس کے لیے جن کا IQ 150 سے 200 تک ہو اور B نارمل کے لئے اور C کم تر ذہنی صلاحیتوں کے بچوں کے لئے جنکے سیکھنے کی رفتار بہت سست ہو یعنی (SLOWLEARNER) کیلئے اس کے ساتھ والدین کو اپنے طور پر بھی ایسے بچوں کو سمجھنا چاہیے۔ شرارتیں اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کا عکس ہوتی ہیں جس بچے کا ذہن کام کرتا ہے۔ لازماً وہ شرارت بھی کرے گا۔ بچے کا شرارت کرنا اتنی تشویشناک بات نہیں جتنا اس کا شرارت نہ کرنا تشویشناک بات ہے۔ اگر آپ کا بچہ شرارت نہیں کرتا تو اسے اس کی خوبی سمجھ کر مت بیٹھ جائیے۔ بلکہ فوراً اس کا تدارک کیجئے اور ماہر نفسیات سے ملیے کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کا بچہ ذہنی طور پر (RETARDED) ہے۔ "یہ کرو" "یہ نہ کرو" کی بجائے بچے کو نفسیاتی طور پر غلط راستے سے صحیح راستے پر ڈال دینا چاہیے۔ مثلاً ایک بچہ کو ٹیلے کی دیواریں خراب کر رہا ہے تو آپ اس کے "ذوق مصوری" کی تسکین ایسے بھی کر سکتے ہیں کہ اسے کاغذ اور پنسل مہیا کر دیں اور اس کے "فن پارے" کی تعریف کر کے اسے اعتماد میں لیں یقین جانئے اس طریقے سے اچھے اور مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔ اور معاشرہ ان شرارتی بچوں پر فخر کریگا۔ جب یہ بچے بڑے ہو کر مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیں گے۔

روزنامہ جنگ
۳۰ اکتوبر ۱۹۸۱

گراہم بیل

جس نے ٹیلیفون ایجاد کیا۔

امان اللہ خان

گراہم بیل اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا۔ بیل کے باپ نے گونگوں اور بہروں کو بولنا سکھانے کا طریقہ ایجاد کیا تھا گراہم بیل اس تعلیم کے لئے لندن گیا بعد میں اسکاٹ لینڈ چلا گیا وہیں اسے ٹیلیفون کی آواز کو حاصل کرنے کی تجویل کے بارے میں سوچا۔ واپس آیا تو اس کی صحت بہت گر چکی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ بیل کو دق کا خطرہ ہے۔ اس کا باپ بیل کو کینیڈا لے گیا۔ کینیڈا میں بیل کی صحت بہتر ہوگئی۔ گراہم بیل نے اپنے باپ سے بہت کچھ سیکھا جب بیل کی صحت اچھی ہوگئی تو اسے خیال آیا کہ پرانے شہر اسٹن میں ایک اسکول کھول لیا۔ اس اسکول میں بیل ان استادوں کو تربیت دیتا جو بہروں کو پڑھاتے تھے۔ بعد میں بیل نے سوچا کہ کوئی ایسا آلہ ایجاد کرنا چاہیے جس سے کئی میل دور بیٹھے ہوئے شخص سے بات کی جاسکے۔ چنانچہ بیل مردوں کے کانوں پر تجربے کرنے لگا۔ رات دن کے تجربوں کے بعد بیل کو معلوم ہوا کہ انسان کے کان میں ایک پتلی جھلی ہوتی ہے۔ یہ جھلی آواز کی لہر سے ہلنے لگتی ہے۔ اب اس نے سوچا کہ اگر وہ بجلی کی طاقت کو اپنی مرضی سے گھٹا بڑھا لے تو انسان کی آواز ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ سکتی ہے۔

انسان کے کان کی بناوٹ معلوم ہوئی تو بیل نے بوسٹن میں دو کمرے کرائے پر لئے۔ کئی روز کی لگاتار محنت کے بعد اس نے ایک جھلا سا آلہ تیار کر لیا۔ اس آلے سے بیل نے اپنے اسسٹنٹ سے یہ بات کہی۔ "مسٹر واٹسن یہاں آیئے۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے" گراہم بیل اپنی ایجاد پر بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنی ایجاد کو نمائش میں رکھا لیکن اس آلے پر کوئی توجہ نہ دی۔ اتفاق سے برازیل کے بادشاہ کو اس آلے کا پتہ چلا تو اس نے ٹیلی فون کا چونگا کان پر رکھ کر گراہم بیل سے کہا کہ "آپ مجھ سے کوئی بات کریں۔ بیل نے اپنے آلے سے شیکسپیئر کے ڈرامے سے ایک فقرہ بولا۔ دوسری طرف کھڑا ہوا برازیل کا بادشاہ اچھل پڑا اور بولا "بالکل صاف آواز آتی ہے"۔ اس طرح گراہم بیل اور اس کا آلہ مشہور ہوگیا۔

ادھر بیل کی ایجاد کامیاب ہوئی تو کئی لوگوں نے ٹیلی فون کے موجد ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ لیکن کافی عرصے کے بعد عدالتوں میں جھگڑے رہنے کے بعد اصل موجد گراہم بیل کو تسلیم کر لیا گیا۔ ٹیلی فون کو لوگوں کے استعمال میں لانے کے لئے کئی لوگوں سے مدد مانگی۔ جب روپے کا انتظام ہوگیا تو ٹیلی فون تیار ہونے لگے

اور گراہم بیل امیر ہوگیا۔ اس کے علاوہ گراہم بیل نے اور دوسری ایجادات بھی کیں۔ مثلاً میں فوٹو فون اور گراموفون کا ذکر میں کیا لیکن سوائے ٹیلی فون کے اور کسی ایجاد سے اس کا نام مشہور نہیں ہوا۔ بیل نے ایک کے گونگے بہرے لوگوں کے لئے بھی اسکول قائم کیا تھا جو کافی عرصہ تک چلتے رہے۔

گراہم بیل سے شادی کے بعد اپنے والد اسکاٹ لینڈ کی بستی ایڈنبرا لوٹا۔ اب وہ بہت مشہور آدمی تھا بیل کے شہر کے لوگوں نے اس کا بڑی عزت کی۔ ۱۹۲۲ء میں گراہم بیل کا انتقال ہوگیا۔ آج جب بھی چلد بھی ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے گراہم بیل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

پاکستانیوں کو یورپی ممالک کے رد کیے گئے تجربات کی بھینٹ کیوں چڑھایا جا رہا ہے

امان اللہ خان

جب اردو قومی زبان ہے تو مقابلے کا امتحان انگریزی میں کیوں؟

گریڈ ۱۷ کے لئے نااہل اور گریڈ ۱۶ کے لئے اہل پبلک سروس کمیشن کے معیار کا پیمانہ کیا ہے؟

روزنامہ نوائے وقت کراچی

کراچی مخمل ۲۶ رجب المرجب ۱۴۰۲ھ ۱۱ مئی ۱۹۸۲

نقطۂ نظر

تعلیمی تعطّل

اور طالب علم تنظیمیں

تحریر: امان اللہ

روزنامہ "نوائے وقت" اور "جنگ" لاہور کے نمائندے نے لکھا ہے کہ ان صاحبان کی رائے ہے کہ طلبہ تنظیموں کو بالکل ختم کر دینا چاہیے۔ ان کا خیال ہے کہ طلبہ تنظیموں کی وجہ سے تعلیمی ادارے بند ہو جاتے ہیں اور تعلیم کا حرج ہوتا ہے۔ ان صاحبان کی رائے ہے کہ طلبہ تنظیموں کی وجہ سے تعلیمی ادارے بند ہو جاتے ہیں اور تعلیم کا حرج ہوتا ہے۔ ان صاحبان کی رائے ہے کہ طلبہ تنظیموں کی وجہ سے تعلیمی ادارے بند ہو جاتے ہیں اور تعلیم کا حرج ہوتا ہے۔

روزنامہ "نوائے وقت" اور "جنگ" لاہور کے نمائندے نے لکھا ہے کہ ان صاحبان کی رائے ہے کہ طلبہ تنظیموں کی وجہ سے تعلیمی ادارے بند ہو جاتے ہیں اور تعلیم کا حرج ہوتا ہے۔ ان صاحبان کی رائے ہے کہ طلبہ تنظیموں کی وجہ سے تعلیمی ادارے بند ہو جاتے ہیں اور تعلیم کا حرج ہوتا ہے۔

پہلے چل جب طلبہ تنظیمیں معرضِ وجود میں آئیں تو ان کا بنیادی مقصد تعلیمی اداروں میں ایسا صحت مند ماحول پیدا کرنا تھا جس میں رہ کر طالب علم اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو ایک نظم اور ضوابط کے تحت بروئے کار لا سکے۔ اس زمانے کی طلبہ تنظیمیں آزاد خیال تھیں جو اپنے اراکین کا احترام کرتے ہوئے طلبہ کے لیے سماجی، ثقافتی، ادبی اور کھیل کود کے مقابلے منعقد کراتی تھیں۔ ان تنظیموں کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی بھی انجمنیں ہوتی تھیں جو طلبہ کی تنظیموں کی سرپرستی کرتی تھیں۔ اس طرح طلبہ ایک نظم کے تحت اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرتے تھے۔

اس زمانے میں طلبہ تنظیموں کے عہدیدار اور اراکین کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کی عزت کی وجہ ان کا اسلام پسند ہونا نہیں بلکہ ان کا اچھا طالب علم ہونا تھا۔ ان کا کردار بے داغ ہوتا تھا۔ ان کی تعلیمی کارکردگی اچھی ہوتی تھی۔ ان کی شخصیت میں ایک وقار ہوتا تھا۔ ان کی گفتگو میں شائستگی ہوتی تھی۔ ان کے لباس میں سادگی ہوتی تھی۔ ان کے چہرے پر ایک نور ہوتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں ایک چمک ہوتی تھی۔ ان کے دل میں ایک درد ہوتا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک کتاب ہوتی تھی۔ ان کے ذہن میں ایک خواب ہوتا تھا۔ ان کے دل میں ایک تمنا ہوتی تھی۔ ان کے ہونٹوں پر ایک دعا ہوتی تھی۔ ان کے چہرے پر ایک سکون ہوتا تھا۔ ان کے دل میں ایک اطمینان ہوتا تھا۔ ان کے ذہن میں ایک روشنی ہوتی تھی۔ ان کے ہاتھ میں ایک قلم ہوتا تھا۔ ان کے دل میں ایک جذبہ ہوتا تھا۔ ان کے ذہن میں ایک خیال ہوتا تھا۔ ان کے دل میں ایک آرزو ہوتی تھی۔ ان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ



بھی ہیں تو طلبہ کی سیاسی جماعتیں اس سے مستثنیٰ کیوں ہیں؟

و تمام یونیورسٹی طلبہ کا اتحاد قرار دے، پھر اس کی بنیاد پر طلبہ یونین بنائی جائیں۔ ہر یونین میں ہر شعبہ کی کلاس نمائندگی ہو۔ یہ یونین اساتذہ کے مشورے سے طلبہ کی تربیت کرائیں۔ ان کی صلاحیتوں کو نظر میں رکھ کر تعلیم کی جائیں، مگر نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ہم نصابی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ یہ تجویز بہت اہم ہے۔

و طالب علموں کو یونیورسٹی میں داخلہ دیتے وقت اس امر کی سختی سے تحقیق کر لی جائے کہ طالب علم کہیں پیشہ ور تو نہیں۔ اس کے لیے فرد کی انتہائی حد ۲۰ سال تک کی جا سکتی ہے جیسا کہ جامعہ پنجاب میں کیا گیا ہے اور ایک فیصد کے بعد دوسرے ایم اے میں داخلے کی عمر حد سختی کی جانی چاہیئے۔

و جو طالب علم ایک کالج یا یونیورسٹی سے نکالا کر

طلباء تنظیموں پر پابندی عائد کیے بغیر تعلیمی اداروں کا ماحول تدریس کیلئے سازگار نہیں بنایا جا سکتا

دیا جائے اسے کسی اور کالج کے کسی شعبے میں داخلے کا اہل نہ سمجھا جائے۔

و داخلہ دیتے وقت پی آر سی کی سختی سے پابندی کی جائے۔ کراچی کے دوسرے علاقوں کے سیاسی کارکن یہاں وکیل یا وکیل بنکیں جو وہ اپنے علاقوں میں کھیلتے رہے ہیں۔ اگر کوٹہ سسٹم کے تحت دوسرے علاقوں کے افراد کو داخلہ دینا ہے تو اس مقصد کے لئے ان طالب علموں کے پاس متعلقہ مالی چالسلر یا پرنسپل کا تصدیقی سرٹیفکیٹ ضرور ہونا چاہیئے جس میں اس امر کی وضاحت ہو کہ متعلقہ طالب علم کسی تخریبی کارروائی میں ملوث نہیں رہا اور اس کا کسی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

و قومی املاک کو نقصان پہنچانے والے افراد کو قید یا کوڑوں کی سزا کے علاوہ بطور تاوان نقصان کی مالیت کے برابر جرمانہ بھی کیا جانا چاہیئے اور یہ جرمانہ ان کی جائیداد بیچ کر حاصل کیا جائے۔ اس کے علاوہ تخریب کار عناصر کی سرکوبی کا کوئی طریقہ نہیں

جہاں تک طلبہ کے جائز اور معقول مطالبات کا تعلق ہے، حکومت کو اپنے تمام ذرائع بروئے کار لا کر ان مسائل کے فوری حل پر خصوصی توجہ دینی چاہیئے تاکہ طلباء پرامن ماحول میں تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف رہ سکیں اور اپنی صلاحیتوں کو ملک و ملت کے بہتر مفاد میں احسن طریق سے استعمال کر سکیں۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ ان میں اپنے دین پر ثابت قدم رہنے والا اس میں انگارہ پکڑنے والے کی مانند ہوگا۔"

بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے: حدیث پاک

روزنامہ

نوائے وقت

کراچی | لاہور | راولپنڈی | ملتان

ہفتہ یکم ربیع الاول ۱۴۰۳ھ ۱۸ دسمبر ۱۹۸۲ء

نقطۂ نظر

امان اللہ خان

اس نظام کی تباہی کا اصل ذمہ دار کون ہے؟

ڈگریاں صحیح قابلیت ظاہر کرنے میں ناکام ہو چکی ہیں

۱۹۷۸ء سے تک کی تمام نوٹیفکیشنز پر سرسری نظر ڈالیں۔ جیسے ہی ہم شروع ہوا۔ ورائٹی میں تنوع نہ ہے ہونے لگیں یہ سسٹم اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لئے مشکل اور تکلیف دہ ثابت ہوا۔

ہر کلاس کو پوری تعلیمی سیشن کو چار حصوں یا سمسٹروں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ہر سمسٹر کے تحت دو ستی نات، ایک سمسٹر کے دوران دو سرا اقسام پر لیا جاتا تھا۔

سوال ۱ - ۸۰ خیصہ ہر وضی [illegible] ۳/۲۵ | ۱۰ء ۲ فیصد کے حاشیہ پر مختلف قسم کے تحقیق سوالات پر مشتمل ہے اس طریقے سے طلباء اور اساتذہ صاف سادہ صورت میں رہتے تھے لاکھ بہانیاں فیاسے کہ کچھ بھی ہمرہ سرتن تھیں ظاہر ہو جاتا تھا اور دوہرہ تھا اور اساتذہ بھی اس کے نفاذ کو کامیاب کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ مگر ایک سال کے دوران ہی اس نئے نظام پر ورڈیں پڑنا شروع ہو گئیں کہ یہ نظام داخل خارجی امتحانات کی طرح تھا اس لئے بعض اساتذہ اپنے پیشے سے الگ ہو گئے۔ سیاسی قوتوں کی مفادات کی بنیاد پر تقریر بننے لگے۔ بنیادی مسئلہ کے حل طلبہ کے لئے چھوٹا شروع ہو گیا۔ ایک اس مطلب استاد کو کمزور سمجھنا کرنے سے ہی تعلیم بڑا ہو جاتا تھا۔

اسی پر اکتفا نہ ہوا بلکہ مروجہ امتحانات کی مدت کو کم کر دیا گیا۔ مدت فی امتحانات کی کامیابی کے لئے صفحہ مارکنگ (۱۸۸ ۱۸۸ ۱۸۸) EGATIZE ہو گیا ایک ادارہ جس نے سکہ بیسا سرے سے ہی ختم کر دیا گیا۔ تیسرا یہ نکلا کہ صرف ہائر ڈیسٹ کی بنیاد پر ۵۰ فیصد نمبر حاصل کرنا طلبہ کے لئے ناممکن نہ رہا۔

اس کے بعد اساتذہ کے لئے ہر سمسٹر کا سلیبس بنانا طلبہ کے لئے محنت اور اساتذہ کے لئے مشکل ہو گیا اور ایک بار پھر نظام کو پہلے خاری نظام کے تحت اساتذہ کو ہر چیک کرنے کے لئے مقرر کر دیا گیا۔ [illegible] ۱۰ء ۲ فیصد کے حاشیہ پر مختلف قسم کے تحقیق سوالات پر مشتمل ہے اس طریقے سے طلباء اور اساتذہ صاف سادہ صورت میں رہتے تھے لاکھ بہانیاں فیاسے کہ کچھ بھی ہمرہ سرتن تھیں ظاہر ہو جاتا تھا اور دوہرہ تھا اور اساتذہ بھی اس کے نفاذ کو کامیاب کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ مگر ایک سال کے دوران ہی اس نئے نظام پر ورڈیں پڑنا شروع ہو گئیں کہ یہ نظام داخل خارجی امتحانات کی طرح تھا اس لئے بعض اساتذہ اپنے پیشے سے الگ ہو گئے۔ سیاسی قوتوں کی مفادات کی بنیاد پر تقریر بننے لگے۔ بنیادی مسئلہ کے حل طلبہ کے لئے چھوٹا شروع ہو گیا۔ ایک اس مطلب استاد کو کمزور سمجھنا کرنے سے ہی تعلیم بڑا ہو جاتا تھا۔

اسی پر اکتفا نہ ہوا بلکہ مروجہ امتحانات کی مدت کو کم کر دیا گیا۔ مدت فی امتحانات کی کامیابی کے لئے صفحہ مارکنگ (۱۸۸ ۱۸۸ ۱۸۸) EGATIZE ہو گیا ایک ادارہ جس نے سکہ بیسا سرے سے ہی ختم کر دیا گیا۔ تیسرا یہ نکلا کہ صرف ہائر ڈیسٹ کی بنیاد پر ۵۰ فیصد نمبر حاصل کرنا طلبہ کے لئے ناممکن نہ رہا۔

اس کے بعد اساتذہ کے لئے ہر سمسٹر کا سلیبس بنانا طلبہ کے لئے محنت اور اساتذہ کے لئے مشکل ہو گیا اور ایک بار پھر نظام کو پہلے خاری نظام کے تحت اساتذہ کو ہر چیک کرنے کے لئے مقرر کر دیا گیا۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[

1983 جون 21

روزنامہ جنگ کراچی

شمسی توانائی اور اس کا استعمال

پاکستان میں اس کو ترقی دیکر توانائی کے بحران پر قابو پایا جاسکتا ہے

امان اللہ خان

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے اور اس کی تقریباً ۷۵ فی صد آبادی دیہاتوں میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ آج تک جتنی بھی حکومتیں آئی ہیں۔ انہوں نے اکثر دیہاتوں میں توانائی کی رسائی پر خاص زور دیا ہے۔ خاص کر دیہاتوں میں بجلی کی فراہمی جس کی بنا پر کسان کی آسانی فائدہ اور دولت کی بچت کے ساتھ ساتھ زیادہ پیداوار کا پہلو خاص کر مدنظر رکھا گیا ہے بجلی کی موجودگی سے ٹیوب ویل با آسانی استعمال کر کے فصلوں کی پیداوار میں بہت اضافہ کیا جا سکتا ہے مگر آج بھی یہ مسئلہ غور طلب ہے۔ اور گاؤں میں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے ہماری زمینوں سے نکلی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا ہے۔

عطیۂ شمسی توانائی قدرت کا لازوال عطیہ ہے اور یہ انسانیت کے لئے گوہر نایاب ہے۔ آج کے اس دور میں انسان اس توانائی سے لاکھوں کام لے رہا ہے۔ گذشتہ ۲۰ برسوں میں انسان نے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدے حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہ فائدے چاہے انسانیت کے مفاد میں ہوں یا نقصان کی شکل میں شمسی توانائی کو ایک سادہ کی صورت میں جمع کر کے اس کی مدد سے بہت بڑے بڑے منصوبوں کو چلایا جا رہا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں توانائی کے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ یورپ میں اس پر بہت زیادہ توجہ دی جا رہی ہے اور خاطر خواہ فائدے حاصل کئے جا رہے ہیں کیونکہ یہ نظام بہت سستا اور دیرپا ہے اس کی زندگی بہت لمبے عرصے تک رہتی ہے۔ اس توانائی سے بہت کم لاگت میں کئی سالوں تک فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جہاں ایک بجلی گھر کی لاگت اور فائدے کا سوال ہے وہاں کم لاگت میں اس نظام سے اتنے ہی فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس کو دن کے علاوہ بہت آسانی سے رات میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

سولر سیل۔ شمسی توانائی کو جمع کرنے کا جدید اور سادہ طریقہ ہے اور دنیا میں بہت سے مقامات میں مختلف مقصدوں پر استعمال ہو رہا ہے اس سیل کو بنانا آسان ہے اور ہم اپنے ملک میں اس کو تیار کر سکتے ہیں۔

آج یورپ میں بہت سی گاڑیاں اور کمپنیاں اس کی مدد سے کام کر رہی ہیں۔ کیونکہ جن ملکوں میں سورج زیادہ روشن نہیں رہتا ہے وہاں اس کے بہت زیادہ فائدے ہیں، یہ توانائی کئی دنوں تک سورج کی غیر موجودگی یا موسم کی خراب حالت میں بہت آسانی سے استعمال کی جا سکتی ہے۔ اور کم لاگت میں ——— کیونکہ، دنیا اس کے لئے بجلی کی ضرورت، زیادہ لمبے کیبل کی۔

جہاں تک بجلی کا تعلق ہے وہ بھی ہر ملک کے ساتھ ساتھ کافی مقدار میں پیدا کرنا بہت مشکل ہے جس کی ملک کو ضرورت ہے۔ اور اگر اس کی پیداوار بڑھ بھی جائے تو بھی دور دراز دیہاتوں تک اس کی رسائی بہت مشکل ہے۔ اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ سولر طریقہ استعمال کر کے ہر گھر میں اپنے ملک کی تمام تر ضروریات کو با آسانی پورا کر سکتے ہیں کیونکہ آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ توانائی کے ذریعے کی قیمت زیادہ اور مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔

آج کل سعودی عرب جیسے ایسے ملک میں سولر طریقہ کا استعمال بہت ہو گیا ہے۔ یہاں روڈ کے ایمرجنسی ٹیلیفون جیسے سعودی عرب میں استعمال ہو رہے ہیں۔ اسٹریٹ لائٹ کے کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سیاحوں کا بیکریز میں جو تقریباً ۳۰۰ سے زیادہ اسٹیشنز پر مشتمل ہے اور ان کے تمام بلڈنگ پر بجلی کا انتظام دن اور رات کو بغیر موسم کے اسی سے چلایا جا رہا ہے۔ اور جدید ترین ذبح خانے موجود ہیں۔

شمسی توانائی کیلئے نہ بجلی گھر کی ضرورت ہے اور نہ میلوں لمبے کیبل کی۔

سعودی عرب کے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور سارا کام ان نظام کے بھی اسی سے سولر انرجی سے حاصل کیا جا رہا ہے۔ اگر پاکستان میں بھی اس جدید نظام اور سستے طریقے کو اہمیت دی جائے تو ہمارا ملک اس قدرتی دولت سے مالا مال ہو سکتا ہے



نوائے وقت
کراچی، لاہور، راولپنڈی، ملتان
کراچی جمعرات ۵ شعبان المعظم ۱۴۰۳ھ ۹ مئی ۱۹۸۳ء

مقابلہ کا امتحان اور سرکاری ملازمین

حکومت پاکستان نے ایک نوٹیفکیشن کے ذریعے مقابلے کے امتحان کے لئے "ترجیحی" امیدواروں کے لئے عمر کی بالائی حد ۲ سال سے بڑھا کر ۳ سال کر دی گئی ہے اور ایک امیدوار زیادہ سے زیادہ تین بار امتحان میں بیٹھ سکتا ہے۔ اس سے پیشتر حالانکہ تعداد صرف دو تھی ایک اچھا قدم ہے لیکن اس سلسلہ میں سرکاری فیصلے کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے سرکاری ملازمین کے مفادات کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچا ہے۔ اگر ان کی عمر کی بالائی حد میں پانچ سال کی رعایت دے دی گئی ہوتی تو بہتر تھا لیکن امتحان میں بیٹھنے کے لئے مزید تین مواقع کی فراہمی سے سرکاری ملازمین کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس سے پہلے سرکاری ملازم کو زیادہ سے زیادہ دو مواقع حاصل تھے جو اب بڑھا کر پانچ کر دیئے گئے ہیں۔ اب اس کے لئے کم از کم یہ رعایت تو ہونی چاہئے کہ اس کے لئے امتحان میں بیٹھنے کی تعداد بھی بڑھا دی جائے۔ اس سے سرکاری ملازمین کا استقبال پیشہ کے لئے راہیں ہموار ہو جائیں گی اور وہ بے فکر ہو کر اپنے فرائض منصبی سرانجام دے سکیں گے۔ امید ہے کہ اس سلسلہ میں حکومت ضرور غور کرے گی۔

(از ادارۂ شبان ملتوی۔ کراچی نمبر ۱)

نوائے وقت
کراچی، لاہور، راولپنڈی، ملتان
کراچی بدھ ۱۸ شعبان المعظم ۱۴۰۳ھ ۱ جون ۱۹۸۳ء

(التحریر از امان اللہ شادان)

اہل افراد نہیں ملتے۔ اہلیت کا معیار کیا ہے؟

فیڈرل پبلک سروس کمیشن سے ایک برمحل سوال۔

فیڈرل پبلک سروس کمیشن نے ۱۹۸۲ء کے سول سروسز کے امتحان کا نتیجہ ۱۹ مئی کو شائع کیا۔ اس کے مطابق ۱۹۸۲ء کے امتحان میں ۱۲۱ آسامیوں کے لئے ۱۲۱ امیدواروں کو کامیاب قرار دیا گیا۔ ۱۲۱ آسامیوں کے لئے ۱۲۱ امیدواروں کا انتخاب ایک عجیب بات ہے۔ عام طور پر ایسے امتحانوں میں جن کے لئے بہت سے امیدوار درخواستیں دیتے ہیں، کامیاب امیدواروں کی تعداد آسامیوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بعض امیدوار کامیاب ہونے کے باوجود اپنی پسند کی آسامی نہ ملنے کی وجہ سے ملازمت قبول نہیں کرتے۔

نظامِ تعلیم میں پرائمری شعبے کی اہمیت

امان اللہ خان ایم اے ایجوکیشن ایل ایل بی

نظامِ تعلیم میں پرائمری شعبے کو جس قدر اہمیت حاصل ہے اس سے کسی شخص کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر اس شعبے کو مضبوط بنیاد پر استوار کیا جائے تو یہ نانوی اور اعلیٰ سطح پر بھی خوشگوار تبدیلیاں لا سکتا ہے۔ کیونکہ اس سطح پر جب بچہ داخل ہوتا ہے تو اس کا ذہن کورے کاغذ کی طرح ہوتا ہے اس وقت کو جو بھی سکھایا جائے اس کا اثر اس کی پوری زندگی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پرائمری شعبہ کسی ملک کے نظامِ تعلیم کی اساس اور بنیاد کا کام دیتا ہے۔ جس قدر بنیادیں مضبوط ہوں گی۔ اسی قدر عمارت مضبوط و مستحکم ہوگی۔ اسی چیز کو محسوس کرتے ہوئے متمدن ممالک میں اس شعبے پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ وہاں پرائمری کی تعلیم و تدریس کا سارا کام اعلیٰ تربیت یافتہ اساتذہ کے سپرد ہے۔

مگر ہمارے ہاں صورتِ حال مختلف ہے، یہاں پرائمری تعلیم پر نہ تو حکومت کی طرف سے کوئی خاص توجہ ملی ہے اور نہ ہی پرائیویٹ سیکٹر کی طرف سے جو پہلے تھا وہی آج بلکہ پہلے سے شدید تر ہے۔ یہاں پرائمری تعلیم کا سارا انتظام پی ٹی سی اساتذہ کے سپرد ہے۔ جو میٹرک کے بعد ایک سال کا کورس کرنے کے بعد بچوں کی تعلیمی تقدیر کے مالک بنا دیئے جاتے ہیں۔ یہ اساتذہ اس قابل نہیں ہوتے کہ پرائمری کے طلبہ کو پڑھا سکیں۔ کیونکہ پرائمری کے طلبہ کو تعلیم دینا اس قدر آسان نہیں جس قدر ہمارے ہاں سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم صرف مقررہ کتابوں کی قرأت کا نام ہی نہیں بلکہ نصاب کے علاوہ بہت سی چیزیں مگر یہاں بھی ہمیشہ سے تعلیم کا جنازہ ہی نکلتا رہا ہے مگر دیکھا گیا

[illegible]

اول تو ہمارے ہاں [illegible] کی کتب تدریس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت و صلاحیت سے عاری ہے۔ اس کا واحد مقصد [illegible] ہوتا ہے۔ بچوں کی عمر، ان کی دلچسپیوں ذہنی صلاحیتوں اور نفسیات کے اصولوں کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً پہلی جماعت میں بچے کو چار یا پانچ برس کی عمر میں داخل کر لیا جاتا ہے۔ اس عمر میں بچے کی توجہ بار بار اِدھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہے اور بچہ اپنے کام کر کے خوشی محسوس کرتا ہے۔ مگر ہوتا کیا ہے؟ اوّل تو استاد کلاس میں کبھی گھستا ہی نہیں۔ اگر گھس گیا تو جہاں بچے کی نظر اِدھر اُدھر ہٹی، ڈنڈے اور گالیوں سے تواضع ہونے لگی۔ استاد صرف ایک دفعہ حروفِ ابجد لکھوا کر سمجھتا ہے کہ بس اس نے اپنا فرض پورا کر لیا حالانکہ میری نظروں سے ایسے بچے بھی گزرتے ہیں جو دو سال سے سکول جا رہے ہیں مگر انہیں ابھی حروفِ ابجد کی پہچان تک نہیں۔ یہ صرف اس لئے ہوتا ہے کہ طلبہ کو سبق میں شامل نہیں کیا جاتا اور ان کی نفسیات اور دلچسپیوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے تدریس نہیں دی جاتی۔ اکثر اساتذہ اس بات کا رونا روتے ہیں کہ ان کے پاس "مناسب فیزیکل" موجود نہیں۔ یہ سراسر بات کو ٹالنے والی مسامحہ ہے۔ پرائمری سطح پر جس قسم کی تدریسی مواد کی ضرورت ہوتی ہے وہ استاد خود بآسانی تیار کر سکتا ہے جب بلیک بورڈ کے لئے چار چار آنے اکٹھے آنے چند بچوں سے وصول کیا جا سکتا ہے تو تدریسی مواد کے لئے بھی والدین روپیہ اکٹھا کرنے یا دینے کو تیار ہو سکتے ہیں

[illegible]

مگر یہ [illegible] ہے جب [illegible] تربیت یافتہ [illegible] ہی شعبہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اب کلرکی کے دھکے کھا کھا کر [illegible] جب پی ٹی سی سند حاصل کرنے کے بعد سکولوں میں جائیں گے تو ان کے معیارِ تعلیم کو بہتر بنانے کی توقع کرنا حماقتوں کی جنت میں بسنا ہے۔ اس سے میرا مقصد پی ٹی سی اساتذہ کی تضحیک نہیں۔ میں صرف حقائق سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں۔

پی ٹی سی بلکہ اساتذہ کی اکثریت اس پیشے میں صرف اس لئے داخل ہوتی ہے کہ انہیں کلرک یا چپڑاسی کی جگہ نہیں ملتی۔ پھر یہ لوگ ابھی عہدِ طفولیت سے گزر رہے ہوتے ہیں طبیعت کا کھلنڈرہ پن انہیں اس پیشے سے حقیقی طور پر وابستہ نہیں رہنے دیتا بلکہ وہ ایسے ریسٹ ہاؤس تلاش کرنے کی طرف بھاگنے کی سوچتے رہتے ہیں۔ اور پھر جو لوگ اس پیشے کو واقعی اپناتے ہیں وہ بھی بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ کم ہی دیتے ہیں۔ ان کی اکثریت ایف اے۔ بی اے اور بی ٹی۔ ایڈ وغیرہ کی تیاری کرتی نظر آتی ہے۔ تاکہ یکدم اگلے سکیل پر چھلانگ لگائی جا سکے۔ ترقی کا جذبہ کوئی بُری بات نہیں۔ ہر فرد کو حق حاصل ہے کہ اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کے لئے تگ و دو کرے مگر یہاں بچوں کے مستقبل سے کھیل کر استاد صاحب اپنے مستقبل کو روشن بنانے پر تلے ہوتے ہیں۔ کلاس روم میں بچے بیکار بیٹھے ہیں مگر استاد جی کے سامنے ایف اے یا بی اے کے ٹیکسٹ پیپرز پڑھے ہوتے ہیں اور وہ خود [illegible]

[illegible] کا بنیادی کام ہوتا ہے۔ اگر ان کے ذہن کی بنیادوں کو [illegible] کر دیا جائے تو [illegible] کی عمارت کے معمار کا [illegible] ہو جاتا ہے۔

اصل میں، نظام جس کو ہم پرائمری سکول کہتے ہیں، اس کو بڑا غلط سمجھا گیا ہے۔ ایک میٹرک پاس اچھا لڑکا صحیح نتائج دے سکتا ہے، مگر ایک اچھا استاد نہیں۔ استاد بننے کے لئے جن اوصاف جمیلہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس سے یہ لوگ عاری ہوتے ہیں سوائے اکا دکا افراد کے۔ دوسرا اکثریت کا یہ حال ہے کہ وہ محض پیسہ کمانے اور روزی گزاری کے لئے تعلیم میں بھرتی ہوتے ہیں۔ جہاں تک اصل تعلیم یافتہ افراد کا تعلق ہے وہ محض اس لئے پرائمری شعبے کی طرف رخ نہیں کرتے کہ ہمارے ملک میں تنخواہیں عہدوں کی بنا پر دی جاتی ہیں تعلیم اور اہلیت کی بنا پر نہیں۔ جبکہ مغربی ممالک میں تنخواہیں قابلیت اور صلاحیت کی بنا پر مقرر کی جاتی ہیں۔ امریکہ میں پرائمری کے لئے ایم اے ایجوکیشن اور ایم ایڈ اساتذہ مقرر ہیں۔

ہمارے ملک میں بھی ادارہ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب ہر سال سینکڑوں طلبہ و طالبات پرائمری شعبے میں ایم اے اور ایم ایڈ کی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں لیکن ان کی خدمات سے صحیح طور پر استفادہ نہیں کیا جا رہا۔ یہ فارغ التحصیل افراد ثانوی مدارس اور کالجوں میں چلے جاتے ہیں کیونکہ اگر وہ پرائمری سکولوں میں کام کریں تو انہیں تنخواہ کا صرف چھٹا سکیل ملے گا۔ جو پی ٹی سی اساتذہ کے لئے مختص ہے۔ اب کوئی ذی شعور شخص چودھویں اور سترھویں سکیل کو چھوڑ کر چھٹا سکیل حاصل کرنے کی حماقت کم از کم آج کے دور میں نہیں کر سکتا۔

ہمارے ملک میں بھی معیار تعلیم اسی صورت میں بہتر ہو سکتا ہے جب پرائمری شعبے کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔ اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ پرائمری سکولوں میں تربیت یافتہ گریجویٹس اور پوسٹ گریجویٹس کو مناسب تنخواہ سکیل



چیف سکریٹری بلوچستان جناب راجہ احمد خان



الحاج جام میر غلام قادر خان



میر فتح بخش خالد میری



نوابزادہ شیخ عمر خان



چاند نی چاند کی صورت کی گھنی زلف کی چھاؤں
پھر اندھیرا نظر آیا نہ اجالا دیکھا

نوائے وقت
کراچی • لاہور • راولپنڈی • ملتان

کوٹہ سسٹم

کیا کھویا کیا پایا

تحریر: اسلم اعوان

ھر صوبے میں دیہی اور شہری علاقوں کو اپنی صلاحیت و ذہانت کے مطابق تعلیم کے یکساں مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ اسی جذبے کے تحت حکومت نے آئین میں کوٹہ سسٹم کو متعارف کرایا تھا۔

پاکستان کے آئین کی دفعہ ۲۵ (۳) کے تحت یہ طے کیا گیا تھا کہ ہر صوبے کے شہری اور دیہی علاقوں کے درمیان تعلیمی اداروں میں داخلے کے لئے آبادی کے تناسب سے کوٹہ مقرر کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ۱۰ فیصد کوٹہ وفاقی حکومت کے لئے مختص کیا گیا تھا۔ اس کوٹہ سسٹم کے تحت ہر صوبے کے شہری علاقوں کو ۴۰ فیصد، دیہی علاقوں کو ۵۰ فیصد اور وفاقی حکومت کے لئے ۱۰ فیصد کوٹہ مختص کیا گیا تھا۔ اس کوٹہ سسٹم کے تحت ہر صوبے کے شہری علاقوں کو ۴۰ فیصد کوٹہ میں سے ۱۰ فیصد کوٹہ ہر صوبے کے دارالحکومت کے لئے مختص کیا گیا تھا۔ اس طرح ہر صوبے کے شہری علاقوں کو ۳۰ فیصد کوٹہ ملنا تھا۔ اس کوٹہ سسٹم کے تحت ہر صوبے کے دیہی علاقوں کو ۵۰ فیصد کوٹہ ملنا تھا۔ اس کوٹہ سسٹم کے تحت ہر صوبے کے دیہی علاقوں کو ۵۰ فیصد کوٹہ ملنا تھا۔ اس کوٹہ سسٹم کے تحت ہر صوبے کے دیہی علاقوں کو ۵۰ فیصد کوٹہ ملنا تھا۔

اس کوٹہ سسٹم کے تحت ہر صوبے کے شہری علاقوں کو ۴۰ فیصد کوٹہ میں سے ۱۰ فیصد کوٹہ ہر صوبے کے دارالحکومت کے لئے مختص کیا گیا تھا۔ اس کوٹہ سسٹم کے تحت ہر صوبے کے شہری علاقوں کو ۳۰ فیصد کوٹہ ملنا تھا۔ اس کوٹہ سسٹم کے تحت ہر صوبے کے دیہی علاقوں کو ۵۰ فیصد کوٹہ ملنا تھا۔ اس کوٹہ سسٹم کے تحت ہر صوبے کے دیہی علاقوں کو ۵۰ فیصد کوٹہ ملنا تھا۔ اس کوٹہ سسٹم کے تحت ہر صوبے کے دیہی علاقوں کو ۵۰ فیصد کوٹہ ملنا تھا۔

بلوچستان	۵ فی صد
پنجاب	۵۰ فی صد
سندھ	۱۵ فی صد
شمالی علاقہ جات اور کراچی	۵ فی صد
آزاد کشمیر	۷ فی صد

صوبہ سندھ میں شہری تقسیم بھی عمل میں لائی گئی اور شہری علاقوں اور دیہی علاقوں کا تعین بھی کیا گیا۔ شہری علاقوں میں کراچی، حیدرآباد اور سکھر کو شہری علاقوں کے علاقے شمار کیے گئے۔ کنٹونمنٹ علاقوں کو بھی شہری علاقے ہی قرار دیا گیا۔ اس طرح سندھ کا ۱۵ فی صد کوٹہ سکڑ کر کچھ اس طرح رہ گیا۔

۱۔ شہری ۱۵ فی صد کا ۶۰ فی صد یعنی ۹ فی صد
۲۔ دیہی ۱۵ فی صد کا ۴۰ فی صد یعنی ۶ فی صد

اس تقسیم کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ سندھ کی شہری آبادی دیہی آبادی سے زیادہ ہے۔ سندھ کا دارالحکومت کراچی ہے اور حیدرآباد جیسے شہر میں زندگی کی تمام تر سہولتیں، تمام تر مواقع اعلیٰ تعلیمی ادارے، بہترین انفراسٹرکچر



خطاب محت اور فتی ہوتیں۔ یہ بہتکلیں طرقی تھے میں باہم اقوام موجود ہیں۔ حکومت سندھ کے دعوے و دلائل کے مطابق قرار اولی کے لیے ذہانہ جملوت کا تصور پیش کرتے ہیں۔ ہمارا ہر کہ سہولتیں کو دیکھی رہا ہے کہ نہیں کہ تقدیر جانے پڑ کی سطح تک گرمنٹ کے اسکولوں میں معاصا ستار تشکیل اسکول کا تصور عام ہے۔ کاؤں کے کسی بچے نے شاید تو سیاہ سے بے نیاز اور لب سوتات استوت ہے بیاز سکولوں نے خاتمے التعلیم ہے جب شاگرد ہی نہ ہوں تو وہاں بھی حالات اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔ ایک عام مشاہدہ ہے کہ کاؤں کا میٹرک پاس علمی لحاظ سے شہر کے پرائمری پاس سے بھی کمزور ہوتا ہے۔ دیہی علاقے سے خارغ التحصیل گریجویٹ اتنا باصلاحیت نہیں ہوتا جتنا شہر کا میٹرک پاس یہ صرف اوپن اعلیٰ تعلیمی اداروں اور جدید تعلیمی ہم نصابی سے مزین ماحول کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اب اگر تمام سہولتیں پر تقریری بنیاد پر اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں میں داخلے کھلے میرٹ کی بنیاد پر کیے جائیں تو ظاہر ہے

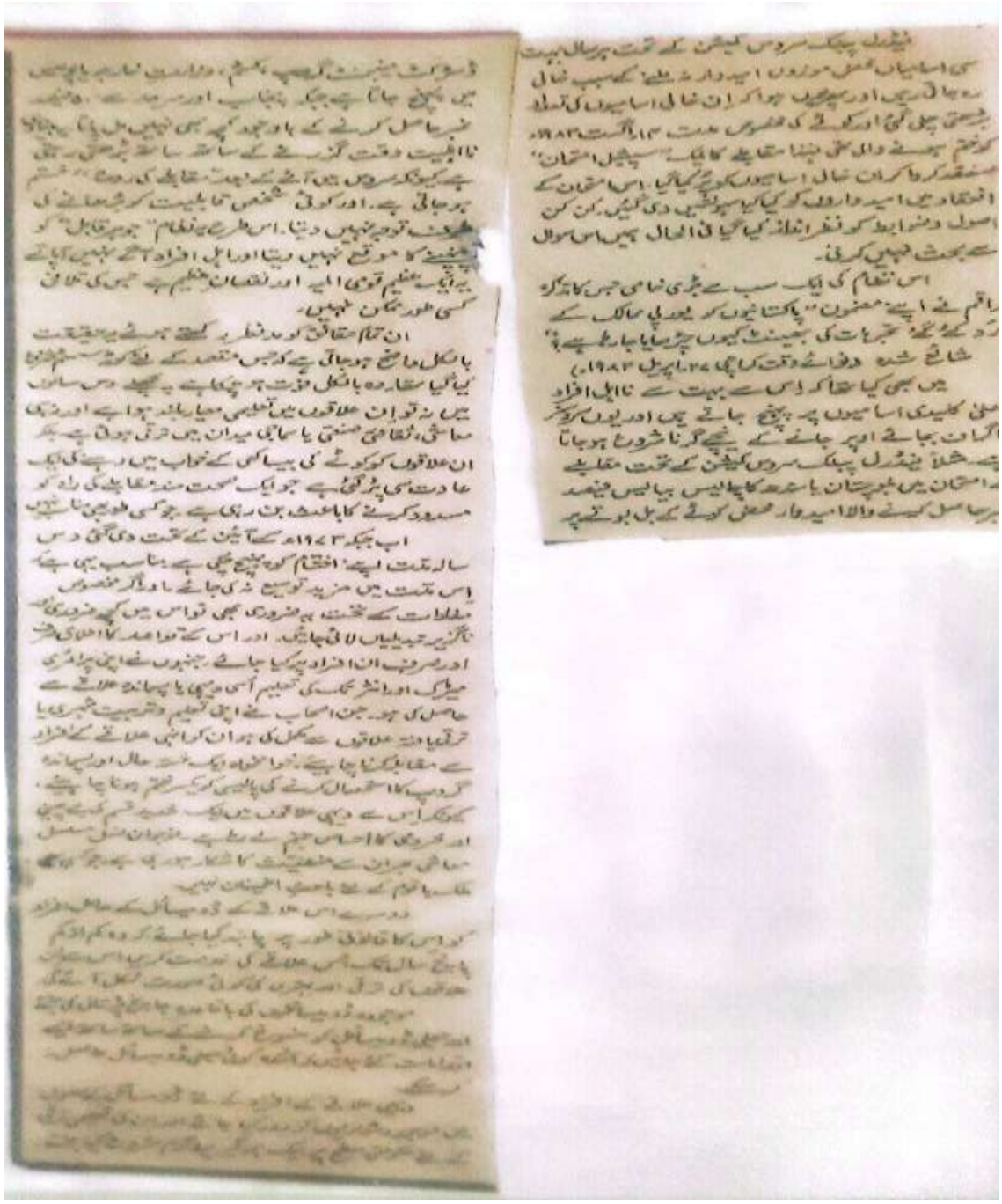

فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے تحت ہر سال بہت سی اسامیاں محض موزوں امیدوار نہ ملنے کے سبب خالی رہ جاتی رہیں اور پھر یوں ہوا کہ ان خالی اسامیوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور کوٹے کی مخصوص مدت ۱۴ اگست ۱۹۸۳ء کو ختم ہونے والی تھی لہٰذا مقابلے کا ایک "سپیشل امتحان" منعقد کروا کر ان خالی اسامیوں کو پُر کیا گیا۔ اس امتحان کے انعقاد میں امیدواروں کو کیا کیا سہولتیں دی گئیں۔ کن کن اصول و ضوابط کو نظر انداز کیا گیا فی الحال ہمیں اس سوال سے بحث نہیں کرنی۔

اس نظام کی ایک سب سے بڑی خامی جس کا تذکرہ راقم نے اپنے مضمون "پاکستانیوں کو یورپی ممالک کے رد کئے گئے تجربات کی بھینٹ کیوں چڑھایا جا رہا ہے؟" شائع شدہ (نوائے وقت کراچی ۲۷ اپریل ۱۹۸۳ء) میں بھی کیا تھا کہ اس سے بہت سے نااہل افراد اعلیٰ کلیدی اسامیوں پر پہنچ جاتے ہیں اور یوں سروسز کا گراف بجائے اوپر جانے کے نیچے گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ مثلاً فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے تحت مقابلے کے امتحان میں بلوچستان یا سندھ کا چالیس بیالیس فیصد نمبر حاصل کرنے والا امیدوار محض کوٹے کے بل بوتے پر

ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ، کسٹم، وزارت خارجہ یا پولیس میں پہنچ جاتا ہے جبکہ پنجاب اور سرحد سے ۵۰ فیصد نمبر حاصل کرنے کے باوجود کچھ بھی نہیں مل پاتا۔ یہ بنیادی نااہلیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے کیونکہ سروس میں آنے کے بعد "مقابلے کی روح" ختم ہو جاتی ہے۔ اور کوئی شخص قابلیت کو بڑھانے کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ اس طرح یہ نظام "جوہر قابل" کو پنپنے کا موقع نہیں دیتا اور اہل افراد آگے نہیں آپاتے یہ ایک عظیم قومی المیہ اور نقصان عظیم ہے جس کی تلافی کسی طور ممکن نہیں۔

ان تمام حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جس مقصد کے لئے کوٹہ سسٹم شروع کیا گیا تھا وہ بالکل فوت ہو چکا ہے۔ پچھلے دس سالوں میں نہ تو ان علاقوں میں تعلیمی معیار بلند ہوا ہے اور نہ ہی معاشی، ثقافتی، صنعتی یا سماجی میدان میں ترقی ہوئی ہے بلکہ ان علاقوں کو کوٹے کی بیساکھی کے خواب میں رہنے کی ایک عادت سی پڑ گئی ہے جو ایک صحت مند مقابلے کی راہ کو مسدود کرنے کا باعث بن رہی ہے جو کسی طور بھی مناسب نہیں۔

اب جبکہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت دی گئی دس سالہ مدت اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے مناسب یہی ہے کہ اس مدت میں مزید توسیع نہ کی جائے اور اگر مخصوص مفادات کے تحت یہ ضروری بھی تو اس میں کچھ ضروری اور ناگزیر تبدیلیاں لائی جائیں۔ اور اس کے قواعد کا اطلاق صرف اور صرف ان افراد پر کیا جائے جنہوں نے اپنی پرائمری میٹرک اور انٹر تک کی تعلیم اسی دیہی یا پسماندہ علاقے سے حاصل کی ہو۔ جن اصحاب نے اپنی تعلیم و تربیت شہری یا ترقی یافتہ علاقوں سے مکمل کی ہو ان کو انہی علاقے کے افراد سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ خواہ مخواہ ایک خستہ حال اور پسماندہ گروپ کا استحصال کرنے کی پالیسی کو یکسر ختم ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس سے دیہی علاقوں میں ایک شدید قسم کی بے چینی اور محرومی کا احساس جنم لے رہا ہے۔ نوجوان نسل مسلسل معاشی بحران سے منفیت کا شکار ہو رہی ہے جو کسی ملک یا قوم کے لئے باعث اطمینان نہیں۔

دوسرے اس علاقے کے ڈومیسائل کے حامل افراد کو اس کا قانونی طور پر پابند کیا جائے کہ وہ کم از کم پانچ سال تک اس علاقے کی خدمت کریں۔ اس سے ان علاقوں کی ترقی اور بہتری کی کوئی صورت نکل آئے گی۔

موجودہ ڈومیسائلوں کی باقاعدہ جانچ پڑتال کی جائے اور جعلی ڈومیسائل کو منسوخ کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے اقدامات کئے جائیں کہ آئندہ کوئی جعلی ڈومیسائل حاصل نہ کر سکے۔

دیہی علاقے کے افراد کے لئے ڈومیسائل کے حصول میں موجود دشواریوں کو دور کیا جائے اور ان کی تعلیمی ترقی کے لئے حکومتی سطح پر ایک ہوگیر پروگرام شروع کیا جائے

نوائے وقت
کراچی، لاہور، راولپنڈی، فیصل آباد، ملتان
کراچی بدھ، ۱۴ محرم الحرام ۱۴۰۳ھ، ۳۰ نومبر ۱۹۸۲ء

سرکاری ملازمین اور وفاقی پبلک سروس کمیشن

ناانصافیوں کے ازالہ سے احتراز نہ کیا جائے

(قمر ... ان اللہ خان)

... کے ... کا ... کے ... کا ... کے ... کا

نوائے وقت
کراچی، لاہور، راولپنڈی، ملتان
کراچی ۱۲ جمادی الثانی ۱۴۰۵ھ، ۲ مارچ ۱۹۸۵ء

الیکشن ۱۹۸۵ء کی امتیازی خصوصیات

(تحریر: ابراہیم اللہ خان)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

باقاعدہ تصدیق شدہ اشاعت ABC CERTIFIED پاکستان کے ہر روزنامے کا سرمایہ

روزنامہ جنگ (منڈے میگزین)

کراچی ○ لاہور ○ راولپنڈی ○ کوئٹہ

۹ر اکتوبر تا ۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۵ء



تحریر: امان اللہ خان

آپ خیر علی منکر کا قول ہے "وقت کا ہاتھ بڑی سے بڑی عمارت کو خاک میں ملا سکتا ہے لیکن کبھی وقت ایک اچھی کتاب کے وجود کو نابود نہیں کر سکتی" کتاب کیا ہے؟ کتاب انسان کی سوچ اور خیالات کا مظہر ہے انسان سوچتا کیوں ہے؟ سوچ مسائل کی پیداوار ہے فطری طور پر انسان بہت حساس واقع ہوا ہے انسان معاشرے کا ایک تلازم ہے وہ معاشرے میں رہتا ہے، معاشرے کو دیکھتا ہے، حالات واقعات پر نظر رکھتا ہے، معاشرے میں ہونے والے مختلف عوامل کا اس کے ذہن پر شدید ردعمل ہوتا ہے اور یہی شدید قسم کا ردعمل کتاب کی تخلیق کا باعث بنتا ہے۔ کتاب کی تخلیق کا سرا اس کو ایک بار قرار کے سر ہوتے ہے بلکہ اگر ہم بنظر غائر دیکھیں تو یہ تخلیق اس معاشرے کی "مس جٹے" کی، ان افراد کی اور اس ماحول کی مرہون منت ہوتی ہے جس میں وہ رہتا ہے۔

عام مفہوم میں کتاب سے مراد چھپے ہوئے مواد کا ذخیرہ ہوتا ہے ۱۹۶۳ء میں منعقدہ یونیسکو کانفرنس سے مطابق "رسائل کے علاوہ ایسا چھپا ہوا مواد ہو کم از کم ۴۹ صفحات پر مشتمل ہو" علم کی وسعت کے ساتھ ساتھ کتاب کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جا رہا ہے لائبریری ایسوسی ایشن آف امریکہ کی اصطلاح میں کتاب اپنے اندر بہت وسعت رکھتی ہے کتاب نہ صرف چھپے ہوئے مواد کا نام ہے بلکہ ٹیسٹ، ریکارڈ، ٹیپ، فلم، ٹیکر، فلم اسٹرپ، سلائیڈ، ٹرانسپیرنسی، مائیکرو فارم بھی کتاب کی تعریف میں آتے ہیں کتاب انسان کی سوچ، خیالات اور مشاہدات کو ترتیب دینے اور طریقے سے محفوظ کرنے کا نام ہے۔

انسان بنیادی طور پر تخلیق پسند ہے وہ جب سے انسانیت سے آشنا ہوا ہے اس کائنات کے مسئلے سے اس کی سوچ بدلتی رہتی ہے اور اس کی سوچ کے ساتھ ساتھ سلسلہ بھی بدلتے رہتے ہیں علم کو محفوظ کرنے کا جو طریقہ سو سال قبل تھا وہ آج نہیں ہے اور سو سال بعد وہ طریقہ نہیں ہو گا جو آج ہے۔ کتاب کی ارتقاء ارتقی کا سفر صدیوں پر محیط ہے کتاب میں تبدیلیاں انسان اپنی ضروریات کے پیش نظر کرتا رہا۔ علم کو آج بھی محفوظ نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ انسان اس وقت بھی علم کو محفوظ کرتا تھا جب کاغذ تھا اس وقت انسان پتھر، وصلت اور پتوں وغیرہ کا سہارا لیتا تھا آج PAPER سافٹ ہے PAPERLESS کا۔

پہلے وسائل اور ضروریات محدود تھیں اور انسان صرف اپنی ذات اور اپنے خاندان کے فائدے کے لئے اپنے علم، اپنی تخلیق محفوظ رکھتا تھا جبکہ دور حاضر میں ایسے ادارے ان کی محنت و کاوش، تحقیق و تخلیق سے ایک عام فیض حاصل کرتا ہے۔

آج کتاب جس شکل میں ہمارے پاس ہے "پہلے کا انسان" اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اس کا اندازہ صرف اس بات سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ کمپیوٹر کے یادداشت بنک میں ایک سیلیکون کے ٹکڑے پر ہزار ایک صفحے سمانے کی گنجائش ہوتی ہے ایک لاکھ الفاظ محفوظ کئے جا سکتے ہیں اور مزید کمپیوٹر میں تو ۱۰ ارب الفاظ تک کی گنجائش ہے واضح رہے کہ ایک جملے میں ایک لاکھ الفاظ (تقریباً) ہوتے ہیں اور ایک ضخیم انسائیکلوپیڈیا میں ۱۰ ارب الفاظ ہوتے ہیں"... اور ہمارے بعد کتاب کی کیا شکل ہوگی.... اس کا اندازہ شاید ہم بھی نہیں کر سکتے کیونکہ سوچ وہاں تک کی رفتار ہماری ذہانت سے کہیں بڑھ کر ہے۔

Scanned with CamScanner

DAILY
NAWA-I-WAQT
KARACHI

روزنامہ

نوائے وقت

بانی مجید نظامی مرحوم — ایڈیٹر رمیز نظامی

کراچی لاہور راولپنڈی اور ملتان سے بیک وقت شائع ہوتا ہے

جلد	شمارہ	تاریخ اجرا		صفحات	قیمت
۶	۳۲۹	۳۱۶۵	اتوار ۲۹ ذوالحجہ ۱۴۰۵ھ ۱۵ ستمبر ۱۹۸۵ء اوج ۲۴۲	۱۲	ڈیڑھ روپیہ

سفر جاڑے سے پہلے

بسوں کے مسافروں کے مسائل

(از مالک اللہ خاں)

سن اکہتر سے ایک سو بیس روپے تولہ سونا ہے۔ سونا ہے جو کراچی سے حیدرآباد سے ملتان سے پشاور سے اور اندرون ملک سفر کرنے کے لئے اس وقت ہر طرف شاہراہوں کا استعمال ہوتا ہے۔ جن میں اکثریت بسوں ہی سفر کرنے کو ترجیح دیتی ہے یہ اندرون کا لیف مسائل سے دوچار ہوتے ہیں اس کے بارے میں قومی اخبارات میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ سندھ ریجنل ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے ارباب اختیار بھی کئی بار اس کا اظہار کر چکے ہیں کہ اس سلسلے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں برتی جا رہی۔ لیکن اس کے باوجود یہ مسائل ہیں کہ روز بروز بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

اس روٹ پر بسوں میں سفر کرنے والے ڈرائیور کنڈکٹر سب سے بڑا مسئلہ بسوں میں اکثر ہونے والی لوٹ مار کا ہے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ شہریوں کے جان و مال کا تحفظ کرے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ ڈکیتی کی واردات ہو جانے کے بعد پولیس موقع پر پہنچتی ہے۔ اس سے پہلے ڈاکو اپنا کام کر کے جا چکے ہوتے ہیں۔ ڈکیتی کی واردات کے بعد پولیس کی کارکردگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈکیتی کی وارداتوں میں ملوث ملزموں کو گرفتار کرنے کی شرح صرف ۱۰ فیصد ہے۔ یعنی ۱۰۰ ڈکیتیوں میں سے صرف ۱۰ ڈکیتیوں کے ملزم گرفتار ہوتے ہیں۔ باقی ۹۰ ڈکیتیوں کے ملزم دندناتے پھرتے ہیں۔ ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ ان ۹۰ ڈکیتیوں کے ملزموں کو گرفتار کرنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ اس کا تعین کرنا بھی مشکل ہے۔ ڈکیتی کی واردات ہو جانے کے بعد پولیس کی کارکردگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ

DAILY
NAWA-I-WAQT
KARACHI

روزنامہ

نوائے وقت کراچی

بانی حمید نظامی مرحوم ایڈیٹر مجید نظامی

کراچی لاہور راولپنڈی اور ملتان سے بیک وقت شائع ہوتا ہے

جلد	شمارہ	ٹیلیگرافک ایڈریس	جمعہ ۱۳ ذوالحجہ ۱۴۰۵ھ ۳۰ اگست ۱۹۸۵ء ۱۸ بھادوں ۲۰۴۲ب	دو روپے
۶	۲۱۵	۳۱۶۵		قیمت

منوڑہ میں سیاحوں کے مسائل

ایمان اللہ خاں

کلفٹن کے بعد منوڑہ ہی وہ واحد ساحلی بستی ہے جو عام شہری کے قریب اور متوسط آمدنی کے لئے تفریح گاہ کا کام دیتی ہے ہر روز سینکڑوں افراد یہاں سیر کے لئے آتے ہیں اور موسم کی تبدیلی اور صحت کی لہروں سے لطف اندوز ہو کر واپس چلے جاتے ہیں۔ منوڑہ کا انتظام و انصرام کنٹونمنٹ بورڈ منوڑہ کی ذمہ داری ہے اگرچہ متعلقہ بورڈ سیر کے لئے آنے والے افراد کو اپنی استطاعت کے مطابق سہولتیں بہم پہنچانے کی متواتر کوششیں کرتا رہتا ہے۔ مگر پھر بھی چند امور ایسے ہیں جو بڑی شدت سے محسوس کئے جاتے ہیں سب سے بڑا مسئلہ لانچوں میں وقود گنجائش سے تین گنا زائد مسافروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے لانچ پلٹنے کھانے لگتی ہے اس قسم کی صورت حال کسی بڑی تباہی اور حادثے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے اگر یہ کراچی پورٹ ٹرسٹ انہیں لانچوں کو کنٹرول کرنے کا ذمہ دار ہے اور وہی انہیں لائسنس بھی جاری کرتا ہے مگر اس مسئلے کے حل کے لئے ابھی تک کوئی ٹھوس منصوبہ بندی اور پیش رفت نہیں کی گئی ہے۔ اگر وہ ادارے سادہ سے نسخہ مانگا کر بہ وصول کرنے کی عادت بھی ایک وبا کی شکل اختیار کر چکی ہے اگر چند لانچوں کے زائد پھیرے بڑھا دیئے جائیں تو مسئلہ کافی حد تک حل ہو سکتا ہے۔ لانچوں کے کرایہ نامے بھی ان کرایہ داروں کو کبھی بھی فراہم نہیں کئے جاتے مثلاً چھوٹی لانچ کا کرایہ ڈیڑھ سو سے منوڑہ یکطرفہ کرایہ پانچ روپے ہے مگر بعض اوقات بیس روپے وصول کرنا ایک عام کارنامہ ہے اور کوئی بھی اعتراض کرتا ہے تو اسے بے عزتی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ تمام لانچوں کا کرایہ نامہ اور ٹکٹ کر دینے ہیں نتیجۃً اسے سیر کئے بغیر واپس جانا پڑتا ہے

کنٹونمنٹ بورڈ نے سیاحوں کی سہولت کے لئے سوزوکی سروس کا اجراء کر رکھا ہے اور سول جیٹی سے پیر الہٰی تک ۵۰ پیسے فی مسافر کرایہ مقرر کر رکھا ہے مگر بیشتر سوزوکی ڈرائیور مسافروں کو نصف راستے میں اتار دیتے ہیں اور پیر الہٰی تک چلنے سے انکار کر دیتے ہیں بعض دفعہ اسی بات پر مسافروں اور ڈرائیوروں میں ماریمیٹ تک کی نوبت بھی آن پہنچتی ہے بورڈ کو اس مسئلے کی طرف بھی خصوصی توجہ دینی چاہئے۔

تیسرے اہم مسئلے کا تعلق اشیائے خورد و نوش سے ہے باسی مچھلی بھوڑے کباب اور صفائی کی فراہمت یہاں عام ہے یہ اشیاء کھلی پڑی رہتی ہیں اور مکھیوں اور گرد و غبار سے بچاؤ کے لئے جال یا کپڑے میں ڈھانپے کر نہیں رکھا جاتا کئی کئی دن کی باسی مچھلی کھا کر لوگ بیمار ہو جاتے ہیں اور اس طرح بیماروں کا ایک گروہ معاشرے کے کھلم کھلا گھومتا رہتا ہے اگرچہ کنٹونمنٹ بورڈ کا باقاعدہ سینیٹری انسپکٹر اور میڈیکل آفیسر موجود ہے مگر نہ جانے ان کی نظر اس طرف کبھی نہیں اٹھتی اس کے علاوہ پینے کے پانی کی اور پارکنگ کی بھی یہاں ایک مسئلہ بن گئی ہے ہر شے یہاں شہر سے دوگنی قیمت پر فروخت ہوتی ہے۔ مثلاً کولڈ ڈرنک کی قیمت بازار میں دو روپے ساٹھ پیسے مقرر ہے مگر منوڑہ میں یہی بوتل تین روپے سے کم نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں گندگی اپنے عروج پر ہے۔

متعلقہ اداروں سے گزارش ہے کہ وہ اس تفریحی مرکز کو قابل توجہ بنانے کے لئے ان مسائل کے حل کے لئے سعی کریں۔

Scanned with CamScanner

نوائے وقت
کراچی ۵ لاہور ۵ راولپنڈی ۵ ملتان
کراچی منگل ۲۴ ذی الحج ۱۴۰۵ھ ۱۰ ستمبر ۱۹۸۵ء

تیل کی طلب میں اچانک اضافہ اور اُس کے اقتصادی مضمرات

نظریہ
ایاز اللہ
خان

چند روز پہلے وفاقی وزیر منصوبہ بندی جناب شاہد رفیع اور قدرتی ذرائع کے ڈائریکٹر جنرل جناب [illegible] نے پریس کانفرنس میں قوم کو جہاں یہ مژدہ سنایا کہ ملک میں تیل کی پیداوار ۳۵ ہزار بیرل یومیہ سے بڑھ کر ۷۰ ہزار بیرل یومیہ ہو گئی ہے، وہیں انہوں نے ملک میں تیل کی بڑھتی ہوئی کھپت کی طرف بھی اشارہ کیا۔ تقریباً ایک ڈیڑھ ماہ پہلے تک ملک میں تیل کی مجموعی کھپت ایک لاکھ ۷۰ ہزار بیرل یومیہ تھی اور ملکی پیداوار کل کھپت کا ۴۲ فی صد۔ اب جبکہ ملکی پیداوار بہرحال اگر طور پر ۷۰ ہزار بیرل یومیہ ہو گئی ہے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے درآمد کا حجم گھٹ کر ۱۰ ہزار بیرل یومیہ رہ گیا ہے۔ اس کی رو سے ملک میں تیل کی بڑھتی ہوئی ضروریات میں اس کمی کی مجموعی کھپت ایک لاکھ ساٹھ ہزار بیرل یومیہ ہو چکی ہے اور ملکی پیداوار ۴۴ فی صد سے کم ہو کر محض ۴۳ فیصد رہ گئی ہے۔ اگر مئی ۱۹۸۴ء میں ہم نے تیل کے نئے ذخائر دریافت نہ کئے ہوتے تو ہماری پیداوار اب تک ۱۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہو چکی ہوتی۔

اس کمی کی بڑھتی ہوئی ضروریات میں اس کمی کو پورا کرنے کا واحد ذریعہ تیل کی مجموعی کھپت ایک لاکھ ساٹھ ہزار بیرل یومیہ سے بڑھ کر ۱۹۸۵ء کے آخر تک ۱۸۰ ہزار بیرل یومیہ ہو جائے گی۔ اگر ہم ۱۹۸۴ء کی طرح ۱۹۸۵ء میں بھی تیل کے نئے ذخائر دریافت کر لیں تو ہماری پیداوار ۱۹۸۵ء کے آخر تک ۱۰۰ ہزار بیرل یومیہ ہو جائے گی۔ اس طرح ہمارا تیل درآمد کرنے کا بوجھ ۸۰ ہزار بیرل یومیہ رہ جائے گا۔ اگر ہم ۱۹۸۵ء میں بھی تیل کے نئے ذخائر دریافت کر لیں تو ہماری پیداوار ۱۹۸۶ء کے آخر تک ۱۲۰ ہزار بیرل یومیہ ہو جائے گی اور ہمارا تیل درآمد کرنے کا بوجھ ۶۰ ہزار بیرل یومیہ رہ جائے گا۔ اگر ہم ۱۹۸۶ء میں بھی تیل کے نئے ذخائر دریافت کر لیں تو ہماری پیداوار ۱۹۸۷ء کے آخر تک ۱۴۰ ہزار بیرل یومیہ ہو جائے گی اور ہمارا تیل درآمد کرنے کا بوجھ ۴۰ ہزار بیرل یومیہ رہ جائے گا۔ اگر ہم ۱۹۸۷ء میں بھی تیل کے نئے ذخائر دریافت کر لیں تو ہماری پیداوار ۱۹۸۸ء کے آخر تک ۱۶۰ ہزار بیرل یومیہ ہو جائے گی اور ہمارا تیل درآمد کرنے کا بوجھ ۲۰ ہزار بیرل یومیہ رہ جائے گا۔ اگر ہم ۱۹۸۸ء میں بھی تیل کے نئے ذخائر دریافت کر لیں تو ہماری پیداوار ۱۹۸۹ء کے آخر تک ۱۸۰ ہزار بیرل یومیہ ہو جائے گی اور ہمارا تیل درآمد کرنے کا بوجھ ختم ہو جائے گا۔ اگر ہم ۱۹۸۹ء میں بھی تیل کے نئے ذخائر دریافت کر لیں تو ہماری پیداوار ۱۹۹۰ء کے آخر تک ۲۰۰ ہزار بیرل یومیہ ہو جائے گی اور ہم تیل برآمد کرنے لگیں گے۔

یہ تو ہوئی وہ صورت جس میں ہم ہر سال تیل کے نئے ذخائر دریافت کرتے رہیں۔ اگر ہم ایسا نہ کر سکے تو ہماری پیداوار ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۱۰ ہزار بیرل یومیہ کی کمی ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۲۰ ہزار بیرل یومیہ کی کمی ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۳۰ ہزار بیرل یومیہ کی کمی ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۴۰ ہزار بیرل یومیہ کی کمی ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۵۰ ہزار بیرل یومیہ کی کمی ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۶۰ ہزار بیرل یومیہ کی کمی ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۷۰ ہزار بیرل یومیہ کی کمی ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۸۰ ہزار بیرل یومیہ کی کمی ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۹۰ ہزار بیرل یومیہ کی کمی ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۱۰۰ ہزار بیرل یومیہ کی کمی ہوتی جائے گی۔

اگر ہم ۱۹۸۵ء میں تیل کے نئے ذخائر دریافت نہ کر سکے تو ہماری پیداوار ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۱۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۲۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۳۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۴۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۵۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۶۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۷۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۸۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۹۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۱۰۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔

اگر ہم ۱۹۸۵ء میں تیل کے نئے ذخائر دریافت نہ کر سکے تو ہماری پیداوار ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۱۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۲۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۳۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۴۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۵۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۶۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۷۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۸۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۹۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ہر سال ۱۰۰ ہزار بیرل یومیہ کم ہوتی جائے گی۔

اشاعت کا یہ سلسلہ جاری رکھنے کے لئے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ اپنا زرِ تعاون آج ہی ارسال فرمائیں۔ شکریہ

DAILY
NAWA-I WAQT
KARACHI

روزنامہ

نوائے وقت کراچی

بانی حمید نظامی مرحوم — ایڈیٹر مجید نظامی

کراچی لاہور راولپنڈی اور ملتان سے بیک وقت شائع ہوتا ہے

جلد	شمارہ	نمبر ڈالیس نمبر	پیر ۱۶ ذوالحجہ ۱۴۰۵ھ ۲ ستمبر ۱۹۸۵ء ۲۱ بھادوں ۲۰۴۲ ب	صفحات	قیمت
۶	۲۱۸	۳۲۶۵		۱۲	۱ روپیہ

نقطۂ نظر

رواداری کا یہ سلسلہ کب تک؟

(امان اللہ خان)

سردار شوکت حیات خان نے یوم آزادی کے موقع پر جب لاہور میں اپنی زبان سے یاسبانِ ملت حضرت قائداعظم، شہید ملت لیاقت علی خان" اور پرچم پاکستان کے بارے میں زہر اگلا ہے اس سے پوری قوم سراپا احتجاج بن چکی ہے۔ اس سلسلے میں "نوائے وقت" نے جو اداریہ اتوار کو لکھا ہے وہ عین عوامی قوم کی امنگوں کی ترجمانی ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ قائداعظم کی مسلم لیگ کا وارث ہونے کا شرف رکھنے والی حکومت اس شخص کے ساتھ کیا برتاؤ کرتی ہے۔

یہ مسئلہ اتنا کم اہم نہیں کہ محض رواداری کے خیال سے اس پر چپ سادھ لی جائے اگر رواداری کی یہ "فراخ دلانہ پالیسی" یونہی برقرار رہی تو کل کو کوئی اور شوکت حیات کھڑا ہو سکتا ہے جہاں حکومت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ سردار کے ان کلمات کا جو اس نے بابائے قوم کے بارے میں ادا کئے ہیں سختی سے نوٹس لے گی وہاں قانون ساز اداروں کو بھی سنجیدگی سے اس امر کی طرف توجہ دینی چاہئے کہ موجودہ تعزیری قوانین میں ایسے ضوابط اور دفعات کا اضافہ فوراً کیا جائے جس کے تحت بانی پاکستان اور شاعر مشرق و اکابرین ملت کے خلاف زہر اگلنے والی زبانوں کو خاموش کر کے انہیں کڑی سے کڑی سزا دی جا سکیں۔

علاوہ ازیں ایسے قوانین کی ضرورت بھی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے جن کے تحت پاکستان میں رہ کر پاکستان کے خلاف بولنے والی زبانوں کو مستقل بند کیا جا سکے۔ اور ایسے اصحاب کو حقوقِ شہریت سے فارغ کر کے انہیں ان کے "آقاؤں" کے ملک برآمد کر دیا جائے جہاں وہ اپنی باقی ماندہ زندگی آرام سے گزار سکیں۔ اور قوم ان کے شر انگیز بیانات سے محفوظ رہ سکے اور ہر دوسرے تیسرے دن اٹھ کر قوم کے جذبات سے کھیلنے کا یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے کیونکہ اب یہ فیشن سا بنتا جا رہا ہے کہ ہر اوّا کا ٹھکرایا ہوا ہر خود ساختہ لیڈر اپنے بیانات اخبارات میں چھپوانے کے شوق میں قائداعظم پاکستان اور اسلام کے خلاف بولنا شروع کر دیتا ہے اور تمام ملک منہ بند کر کے اسے سنتا رہتا ہے حکومت جو اپنی پالیسیوں پر تنقید سُننے کی عادی ہو چکی ہے یہ بیانات سن کر اسے بھی گویا چپ سی لگ جاتی ہے عوام یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا کیا واقعی ملک میں تحریر و تقریر کی اتنی آزادی مل چکی ہے کہ جس کا جو دل چاہے بکتا رہے اور کوئی اسے پوچھنے والا نہ ہو؟ اگر نہیں تو پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے کہ اکبر بگٹی سردار شوکت حیات اور جی ایم سید جیسے افراد آج بھی کھلے پھر رہے ہیں اور باقاعدہ باعزت گردانے جاتے ہیں ایک عام سا اصول ہے جس کو یہ ملک پسند نہیں۔ وہ کہیں اور چلا جائے یہ کیا بات ہوئی کہ کھائیں یہیں اور بیٹا بھی یہیں جائیداد یں بھی یہاں بنائیں، کھالیاں بھی اسی ملک اور اسی قوم کے گھٹیا ہیرو کو جن کی جوتیوں کے صدقے یہ "دانائے" عظیم سمجھے جاتے ہیں۔

حکومت سے التماس ہے کہ وہ ایک واضح پالیسی اپنائے اور اس قسم کے شر پسند بہادر لوگوں کو لگام دے۔

Scanned with CamScanner

DAILY
NAWA-I-WAQT
KARACHI

روزنامہ

نوائے وقت کراچی

بانی حمید نظامی مرحوم ایڈیٹر مجید نظامی

کراچی لاہور راولپنڈی اور ملتان سے بیک وقت شائع ہوتا ہے

جلد	شمارہ	رجسٹرڈ ایس نمبر	بدھ ۱۸ ذوالحجہ ۱۴۰۵ھ ۴ ستمبر ۱۹۸۵ء ۲۳ بھادوں ۲۰۴۴ب	صفحات	قیمت
۶	۳۲۰	۳۱۶۵		۱۲	ڈیڑھ روپیہ

کاروبار یا تعلیم کا فروغ؟

۳۱ اگست ۱۹۸۵ء کے قومی اخبارات میں انسٹیٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن (کراچی یونیورسٹی) کا شام کی کلاسوں میں داخلے کے لئے درخواستیں طلب کرنے کا ایک اشتہار نظر سے گزرا۔ اشتہار کے مندرجات پڑھنے کے بعد یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ ایک ایسے پاکستانی تعلیمی ادارے کا اشتہار ہے جو تجارتی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے قائم کیا گیا ہے وہ اس لئے کہ اس میں صرف داخلے کے ٹیسٹ کی فیس دو سو روپے مقرر کی گئی ہے جو ناقابل واپسی بھی ہے یہ داخلہ ٹیسٹ صرف ایک پرچہ پر مشتمل ہے اور اس ٹیسٹ کی اتنی فیس کسی طور پر بھی مناسب نہیں ہے۔ جبکہ اس میں داخلے کی واضح ضمانت بھی نہ دی گئی ہو کہیں فیسوں میں اس قدر اضافے سے ادارے کے ناظمین کے دھن میں یہ تصور تو نہیں کہ اس کورس میں کم آمدنی والے یا نادار مگر ذہین طلبا داخلہ نہ لے سکیں اگر ایسا ہے تو انہیں اشتہار میں یہ بالکل واضح کر دینا چاہیئے تھا کہ اس پروگرام میں صرف ایک مخصوص طبقہ ہی داخلہ لے سکتا ہے اور باقی صرف اشتہار کے مندرجات سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ راقم کو اچھی طرح سے یاد ہے کہ ۱۹۸۰ء میں اسی داخلہ ٹیسٹ کی فیس صرف بیس روپے تھی جو ہر لحاظ سے جائز اور معقول تھی اور اب فیس دو سو روپے تک جا پہنچی ہے گویا ان پانچ سالوں میں اس میں دو ہزار فی صد اضافہ کر دیا ہے ابھی چھ ماہ پہلے یہی ٹیسٹ فیس ایک سو روپے تھی اور اتنی قلیل مدت میں اس میں صد فیصد اضافے کا جواز نہ تو اخلاقاً درست ہے نہ طبقے کے لئے محدود عرصے کے کچھ ادارے نظر نہیں آتا حالانکہ پبلک سروس کمیشن کے امتحانات اور انٹرویو کی فیس جو کہ ایک طویل دورانیے پر مشتمل ہوتے ہیں صرف پچاس ساٹھ روپے ہے اور پھر متعلقہ ادارہ کوئی نجی بھی نہیں بلکہ باقاعدہ کراچی یونیورسٹی کا ایک جزو ہے اور مذکورہ یونیورسٹی کے کسی اور شعبے میں اتنی زیادہ داخلہ ٹیسٹ فیس کہیں نہیں رکھی گئی۔ اور پھر یہ تو ٹیوشن فیس بھی نہیں محض داخلہ ٹیسٹ فیس ہے جس کا مقصد طالب علم کے رجحان کا پتہ چلانا ہے کہ آیا وہ اس ادارے یا پروگرام میں داخلہ لینے کا اہل ہے یا نہیں۔ اب محض اتنی سی بات اور اتنے چھوٹے سے ٹیسٹ کی اتنی زیادہ فیس اور پھر یہ ٹیسٹ کوئی یا نہیں بلکہ عرصہ سے وہی پرچہ بار بار لینے آنے والوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور KEY کی مدد سے تھوڑی ہی دیر میں اس کی مارکنگ بھی ہو جاتی ہے یہ کاروبار ہے کہ تعلیم کا فروغ۔ کیا ادارے کی انتظامیہ اس کا جواب دینے کی زحمت گوارا کرے گی؟ اور کیا ایسے میں وزیراعظم جناب جونیجو کا یہ اعلان کوئی معنویت رکھتا ہے کہ "تعلیم کو کاروباری مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی"۔ (امان اللہ خاں منوڑہ کراچی سے)

Scanned with CamScanner

۲۸ دسمبر ۱۹۸۵



ارکانِ اسمبلی اور ملازمتوں میں کوٹہ

"نوائے وقت" مورخہ ۲۷ دسمبر کی اشاعت میں تھرپارکر سے صوبائی اسمبلی کے ایک معزز رکن کا بیان نظر سے گزرا جس میں انہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ ارکان اسمبلی کو مختلف محکموں میں ملازمتوں میں کوٹہ دیا جائے تاکہ وہ اپنے حلقے میں بیروزگار نوجوانوں کو روزگار دلا سکیں معزز رکن اسمبلی کا یہ بیان اپنی نوعیت کے اعتبار سے قطعاً نیا یا انوکھا نہیں اس سے قبل بھی بہت سے ارکان اسمبلی ترقیاتی فنڈز، ملازمتوں کی تقسیم کا کوٹہ میں یا پیشہ وارانہ تعلیمی اداروں اور ملازمتوں میں ارکین اسمبلی کے لئے مخصوص کوٹے کا مطالبہ کر چکے ہیں اور حکومت نے ان مطالبوں کو شرف قبولیت بھی بخشا ہے اور کوئی عجیب نہیں کہ تعلیمی اداروں میں داخلے یا سروس کے سلسلے میں بھی ان کے مطالبات کو تسلیم کیا جائے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ارکین اسمبلی کو یہ تمام مراعات کیوں دی جائیں؟ کیا صرف اس لئے کہ وہ عوامی نمائندے ہیں؟ عوام نے انہیں اس لئے منتخب نہیں کیا کہ وہ قانون سازی جیسے اہم فریضہ کو بالائے طاق رکھ کر سرکاری ٹھیکوں یا ملازمتوں میں اپنے حلقے کے پیچھے بھاگتے پھریں اور مقننہ کا کام ادھورا رہ جائے سیاسی رشوت، اقربا نوازی اور ملازمتوں میں کوٹے کا تعلق چاہے ارکین اسمبلی کو یہ حق دینے سے بہت سی قباحتیں جنم لیں گی اس کا مشاہدہ ہم سابقہ حکومت کے دور میں کر چکے ہیں سابقہ نام نہاد عوامی حکومت نے "بندر بانٹ" کی انتہا کر دی تھی اس دور میں جن افراد کو ارکین اسمبلی نے نوازا ان کا تعلق صرف حکمران جماعت سے تھا یا پھر ارکین اسمبلی پارٹی کے امیدوار سے عام آدمی اس "بہتی گنگا" کے دور میں بھی ہاتھ دھو سکا انسان فطرتاً کمزور واقع ہوا ہے اور پھر معزز ارکین اسمبلی عوام کے ووٹوں سے اس مقام تک پہنچے ہیں اگر انہیں سرپرستی میں یا فنڈز دے دیئے جائیں تو وہ عام افراد کو کس طرح نظر انداز کر سکیں گے جنہوں نے ان کے حلقہ انتخاب میں پانی کا لوٹا روپیہ پیسا اور ووٹوں کی خاطر

چاکسرو کے لئے کیا کیا؟ ملازمتیں عام افراد کو نوازا جائے گا اس سے ان نوآبادیاتی افراد کی محرومی ختم ہو گی جن کا تعلق ارکین کے گروپ سے نہیں ہو گا؟ اور وہ ملازمتوں سے باوجود اہلیت کے اس لئے محروم رہ جائیں گے کہ ان کا رابطہ معزز رکن سے نہیں تھا اگر اس قسم کی صورت حال پیدا نہ بھی ہو تو بھی مخالف پارٹی یا گروپ کے الزامات یقیناً ضرور اپنا وزن رکھیں گے کیا یہ بہتر نہیں کہ اس قسم کی صورت حال کو پیدا ہی نہ ہونے دیا جائے بلکہ "معقولیت" کی راہ اختیار کر کے مسئلے کی سنگینی کو سمجھا ہی نہ جائے؟ ارکین اسمبلی غالباً سرپرستی کوٹہ اسی لئے چاہتے ہیں کہ انہیں سرکاری یا عوامی تقریبوں کے دوران اپنے حلقہ نہیں ہے اگر یہ خصوص کیا جا رہا ہے کہ مختلف محکموں میں ملازمتوں کے لئے انتخاب میں دھاندلی ہو رہی ہے اور میرٹ کا سرکش گھوڑا قابو میں نہیں آ رہا تو اس کے لئے یہ راستہ قطعاً بہتر نہیں جس کا انتخاب ان ارکین نے کیا ہے انہیں ملازمتوں میں کوٹہ مانگنے کی بجائے متعلقہ سلیکشن بورڈ میں نمائندگی مانگنی چاہیئے تاکہ وہ ہیرو کریسی کو من مانی کرنے سے روک سکیں اور اس امر کی نگرانی کر سکیں کہ ملازمتوں میں تقرر کے سلسلے میں حق و انصاف سے کام لیا جا رہا ہے یا نہیں؟ اس کام کی ابتدا ضلع اور تحصیل کی سطح پر سرکاری و نیم سرکاری نان گزیٹڈ سروس سے ہونی چاہیئے جہاں متعلقہ ارکین اسمبلی باقاعدہ سلیکشن بورڈ کے ارکین کی حیثیت سے تقرریوں کا جائزہ لیں مجھے امید ہے کہ معزز ارکین اسمبلی اور حکومت ان گزارشات پر غور و تدبر کریں گے کیونکہ اس میں نمائندوں کی عزت ہے اور وقار ہے۔

(امان اللہ خان منوڑہ کراچی سے ٹیلیفون)

Scanned with CamScanner

بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے: حدیث پاک

نوائے وقت

کراچی، لاہور، راولپنڈی، ملتان

فٹ پاتھوں پر غلاظت

شہریوں کے لئے بیت الخلا کی تعمیر کراچی میونسپل کارپوریشن کی ذمہ داری ہے مگر یہ کارپوریشن اکا دکا مقامات پر پبلک بیت الخلا تعمیر کر کے یہ سمجھ لیتی ہے کہ اس نے اپنا فریضہ سرانجام دے لیا اور ان بیت الخلاؤں میں صفائی کی حالت بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ایک فرلانگ دور سے ہی بدبو کے بھبکارے نشاندہی کر دیتے ہیں کہ یہاں کوئی عوامی پیشاب گھر موجود ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ ان بیت الخلاؤں کا رخ ہی نہیں کرتے کیونکہ یا تو یہ بہت دور ہوتے ہیں یا پھر ان میں صفائی کی صورت حال اتنی ابتر ہوتی ہے کہ وہ صاف شفاف فٹ پاتھوں کو اسی مقصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مارکیٹ اور تجارتی مراکز کے فٹ پاتھوں کے علاوہ وہ گھر بھی ان افراد سے نہیں بچ سکتے جو کسی معروف و مصروف سڑک کے کنارے واقع ہیں گھروں کے سامنے دیواروں کی اوٹیں چند ہی روز میں "بیت الخلاؤں" میں تبدیل کر دی جاتی ہیں اور اس گھر کے مکینوں کے ساتھ اہل محلہ کی زندگی بھی اجیرن کر دی جاتی ہے! اس قسم کی کیفیت اکثر بس اسٹاپوں، سینما گھروں یا تجارتی مراکز کے قریب فٹ پاتھوں پر دیکھی جا سکتی ہے۔ جہاں غلاظت بہہ بہہ کر راہ گیروں کے کپڑے خراب کر رہی ہوتی ہے۔

دوسرے یہ لوگ ستر کی پابندی بھی نہیں کرتے خواتین اور طالبات کا گزر بھی ان مقامات سے اکثر ہوتا رہتا ہے یہ لوگ بڑی ڈھٹائی سے اپنے "کام" میں مصروف ہوتے ہیں۔ اور اکثر صورتوں میں یہ "کام" پولیس کی ناک تلے ہو رہا ہوتا ہے مثلاً صدر میں ریگل اسٹاپ پر پولیس ہر وقت تعینات رہتی ہے اور اس سے چند قدم دور فٹ پاتھ پر لوگ سرعام قطار در قطار غلاظت پھیلاتے میں مصروف ہوتے ہیں۔ اکثر مالکان مکان اپنی دیواروں پر گالیاں اور غلط قسم کے فقرات بھی لکھ دیتے ہیں تاکہ لوگ غلاظت پھیلانے سے باز رہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ رجحان بڑھتا جا رہا ہے اس کا واحد حل یہ ہے کہ کارپوریشن ہر معروف بس اسٹاپ اور تجارتی مرکز کے قریب بیت الخلا تعمیر کرے اور اس کی صفائی کی حالت کو بہتر بنانے کا معقول انتظام بھی کرے۔ دوسرے فٹ پاتھوں اور رہائشی گھروں کے قریب گندگی پھیلانے والوں کے خلاف ایک مہم شروع کی جائے اور انہیں موقع پر سزا دی جائے تاکہ وہ آئندہ صحت عامہ سے کھیلنے اور شہر کی پاکیزگی پامال کرنے کی جرات نہ کریں۔

(امان اللہ خاں منوڑا کراچی)

Scanned with CamScanner

روزنامہ پاکستان
راولپنڈی
اسلام آباد
ملتان

لاہور 26 جمادی الثانی 1411ھ ـ 13 جنوری 1991ء

عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی کے مضمرات

کلثوم اللہ خان

دیوانی	3	0	3,932
فوجداری	1	7	2511
سیشن	1	9	11,849
کل	7	42	27,474

ہر پرگورنمنٹ آف پاکستان کے انتظامات کی روشنی میں حکومت جناب سے عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی کا کس تناظر سے عمل کرنا شروع کر دیا ہے اور اس سمت میں پہلی پیش رفت انسٹھ مجسٹریٹوں کی سے پہلی مجسٹریٹ صاحبان کی خدمات "عدالتی امور" کی انجام دہی کے لئے باقی کورٹ کے سپرد کر دی گئی ہیں۔ یہ مجسٹریٹ صرف اور صرف عدالتی امور سرانجام دیں گے اور انتظامی نوعیت کے معاملات سے ان کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

اس سے قبل 74-1973ء میں بھی حکومت جناب نے عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی کے لئے ٹوٹل تین سو اکہتر (371) کیڈر کا تعین کیا تھا۔ اور اس میں مجسٹریٹ گریڈ ایک سے تین تک کے افسران کی تعداد تقریباً ساڑھے تین سو بنتی تھی۔ اس وقت بھی یہ طے ہوا تھا کہ عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی کے بعد یہ افسران صرف عدلیہ کے ماتحت ہی کام کریں گے۔ مگر یہ اسکیم کبھی بھی عملی شکل نہ اختیار کر سکی۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عدلیہ کی علیحدگی کے بعد یہ افسران کہاں کھپائے جائیں گے۔ مگر موجودہ حکومت نے یہ طے کر لیا ہے کہ عدلیہ کی علیحدگی کے لئے جو بھی قربانی دینی پڑے وہ دی جائے گی۔ اور اب یہ تمام افسران (مجسٹریٹ) عدلیہ کے ماتحت ہوں گے اور ان کا کام صرف عدالتی امور سرانجام دینا ہوگا۔

اس وقت ملک میں مجسٹریٹ کی تعداد 1500 کے لگ بھگ ہے۔ جن میں سے 1200 مجسٹریٹ کو پہلے مرحلہ میں عدلیہ کے ماتحت کر دیا جائے گا۔ اور باقی 300 مجسٹریٹ کو دوسرے مرحلہ میں عدلیہ کے ماتحت کر دیا جائے گا۔ اس طرح 1200 مجسٹریٹ صاحبان کی خدمات عدلیہ کو منتقل ہو جائیں گی۔ اور ان کی جگہ پر پولیس افسران کو مجسٹریٹ کے اختیارات دے دیئے جائیں گے۔ مگر یہ اختیارات صرف ان پولیس افسران کو دیئے جائیں گے جو کہ ایس پی یا اس سے اوپر کے عہدہ پر فائز ہوں گے۔ اس طرح ایس پی یا اس سے اوپر کے عہدہ پر فائز پولیس افسران کو مجسٹریٹ کے اختیارات دے دیئے جائیں گے۔ مگر یہ اختیارات صرف ان پولیس افسران کو دیئے جائیں گے جو کہ ایس پی یا اس سے اوپر کے عہدہ پر فائز ہوں گے۔ اس طرح ایس پی یا اس سے اوپر کے عہدہ پر فائز پولیس افسران کو مجسٹریٹ کے اختیارات دے دیئے جائیں گے۔

علیحدگی کے فیصلہ پر مزید غور و فکر کی ضرورت ہے

بہت سی ایسی مجسٹریٹ کی ذمہ داریاں ہیں جن سے فوری طور پر علیحدگی ممکن نہیں ہوگی۔ اس لئے ان کو پہلے مرحلہ میں علیحدگی سے مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔ اور ان کی علیحدگی دوسرے مرحلہ میں ہوگی۔ اس طرح یہ مجسٹریٹ صاحبان جو کہ پہلے مرحلہ میں علیحدگی سے مستثنیٰ کر دیئے جائیں گے۔ ان کی تعداد 300 کے لگ بھگ ہوگی۔ اس طرح یہ 300 مجسٹریٹ صاحبان جو کہ پہلے مرحلہ میں علیحدگی سے مستثنیٰ کر دیئے جائیں گے۔ ان کی تعداد 300 کے لگ بھگ ہوگی۔ اس طرح یہ 300 مجسٹریٹ صاحبان جو کہ پہلے مرحلہ میں علیحدگی سے مستثنیٰ کر دیئے جائیں گے۔ ان کی تعداد 300 کے لگ بھگ ہوگی۔

اس طرح یہ 300 مجسٹریٹ صاحبان جو کہ پہلے مرحلہ میں علیحدگی سے مستثنیٰ کر دیئے جائیں گے۔ ان کی تعداد 300 کے لگ بھگ ہوگی۔ اس طرح یہ 300 مجسٹریٹ صاحبان جو کہ پہلے مرحلہ میں علیحدگی سے مستثنیٰ کر دیئے جائیں گے۔ ان کی تعداد 300 کے لگ بھگ ہوگی۔

اس طرح یہ 300 مجسٹریٹ صاحبان جو کہ پہلے مرحلہ میں علیحدگی سے مستثنیٰ کر دیئے جائیں گے۔ ان کی تعداد 300 کے لگ بھگ ہوگی۔ اس طرح یہ 300 مجسٹریٹ صاحبان جو کہ پہلے مرحلہ میں علیحدگی سے مستثنیٰ کر دیئے جائیں گے۔ ان کی تعداد 300 کے لگ بھگ ہوگی۔

ضلع	مجسٹریٹ کی تعداد	جوڈیشل مجسٹریٹ	
ملتان	3	16	9,182

Scanned with CamScanner



روزنامہ پاکستان
لاہور
مثل 9 شعبان 1413ھ 2 فروری 1993ء

فراہمی انصاف اور مجسٹریٹوں کی مشکلات

کامران نیئر خان

روزنامہ 1990ء میں پہلی بار کورٹ آف ایگزیکٹو مجسٹریٹ کا نظام کی روشنی میں حکومت پنجاب نے صوبہ کی انتظامیہ سے جوڈیشل کے کچھ اختیارات واپس لے کر ایگزیکٹو مجسٹریٹ کا نظام رائج کیا تھا۔ اس کے تحت 261 مجسٹریٹوں میں سے 150 کو انصاف بلاک کے حوالے کر دیا گیا۔ اس وقت ان کا مقصد یہ تھا کہ عدالتوں پر کیسز کا بوجھ کم ہو اور انصاف جلد مہیا کیا جا سکے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اب ایک بار پھر یہ تجویز زیر غور ہے کہ ایگزیکٹو مجسٹریٹ کے اختیارات واپس لے کر عدلیہ کو دیئے جائیں۔ اس سلسلہ میں ہمارے نامہ نگار کامران نیئر خان نے مجسٹریٹوں کے مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ ادارہ

ملک میں انصاف کی فراہمی کے ذمہ دار ادارے عدلیہ اور مجسٹریسی ہیں۔ ان دونوں اداروں کے ذمہ داران کا کہنا ہے کہ ان کے اختیارات کو ایک دوسرے کی طرف منتقل کرنے سے انصاف کی فراہمی میں بہتری نہیں آئے گی۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے انصاف کی فراہمی میں مزید تاخیر ہو گی۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے انصاف کی فراہمی میں مزید تاخیر ہو گی۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے انصاف کی فراہمی میں مزید تاخیر ہو گی۔

ان دنوں پنجاب کے اکثر اضلاع میں پولیس کے خلاف وکلاء کی ہڑتالوں اور عدالتوں کے بائیکاٹ کی وجہ سے انصاف کی فراہمی کا نظام بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ ایسے میں ایگزیکٹو مجسٹریٹ کے اختیارات واپس لینے کا مطالبہ کیا جانا ایک اہم سوال ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے ایگزیکٹو مجسٹریٹ کے اختیارات واپس لینے کے مطالبہ کے پس منظر اور اس کے ممکنہ اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ ادارہ

ایگزیکٹو مجسٹریٹ کے اختیارات واپس لینے کا مطالبہ کیوں کیا جا رہا ہے؟ اس کے پس منظر میں کیا عوامل کارفرما ہیں؟ اس کے ممکنہ اثرات کیا ہو سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں ہم نے ایگزیکٹو مجسٹریٹ کے اختیارات واپس لینے کے مطالبہ کے پس منظر اور اس کے ممکنہ اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ ادارہ

ایگزیکٹو مجسٹریٹ کے اختیارات واپس لینے کا مطالبہ کیوں کیا جا رہا ہے؟ اس کے پس منظر میں کیا عوامل کارفرما ہیں؟ اس کے ممکنہ اثرات کیا ہو سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں ہم نے ایگزیکٹو مجسٹریٹ کے اختیارات واپس لینے کے مطالبہ کے پس منظر اور اس کے ممکنہ اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ ادارہ

ایگزیکٹو مجسٹریٹ کے اختیارات واپس لینے کا مطالبہ کیوں کیا جا رہا ہے؟ اس کے پس منظر میں کیا عوامل کارفرما ہیں؟ اس کے ممکنہ اثرات کیا ہو سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں ہم نے ایگزیکٹو مجسٹریٹ کے اختیارات واپس لینے کے مطالبہ کے پس منظر اور اس کے ممکنہ اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ ادارہ

Scanned with CamScanner



پاکستان

8 دسمبر 1993ء

کیا عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی ممکن ہے؟

ایس ایچ خان



روزنامہ
THE DAILY
Pakistan
LAHORE
پاکستان
لاہور
476301-10 : ٹیلی فون
1 | ۲۷ رجب المرجب 1411ھ 13 فروری 1991ء فاغ چاگن 2047 بکرمی 12 فیبروری 3 عیسوی

عدالتوں سے ملزموں کا فرار

اداریہ صفحہ

نظام عدل کی بدولت یہ عام تاثر پایا جاتا ہے کہ عدالتوں سے ملزموں کا فرار

علامہ اقبال نے کہا تھا

"ہے مرد کی زینت اس سے
جس سے کہ جہاں میں
عدالت بھی حزیں ہے
نازک"

علامہ اقبال مغربی جمہوریت کے بڑے مداح تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ جمہوریت ہی ہے جس کی بدولت عدالتوں کی اہمیت اور تقدس میں اضافہ ہوا ہے۔ جمہوریت کی بنیاد ہی اس اصول پر ہے کہ ہر شخص قانون کی نظر میں برابر ہے۔ اس اصول کی بدولت ہی عدالتوں کو یہ اختیار حاصل ہوا ہے کہ وہ ہر شخص کو قانون کے سامنے جواب دہ بنا سکیں۔ عدالتوں کے اس اختیار کی بدولت ہی ان کا وقار بلند ہوا ہے۔ عدالتوں کے اس اختیار کی بدولت ہی ان کا وقار بلند ہوا ہے۔ عدالتوں کے اس اختیار کی بدولت ہی ان کا وقار بلند ہوا ہے۔

عدالتوں کے وقار کی بلندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر شخص عدالت کے سامنے پیش ہونے کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ عدالتوں کے وقار کی بلندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر شخص عدالت کے سامنے پیش ہونے کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ عدالتوں کے وقار کی بلندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر شخص عدالت کے سامنے پیش ہونے کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔

روزنامہ
لاہور
THE DAILY
Pakistan
LAHORE

منشیات کے خلاف جہاد..... ایک جائزہ؟

لیاقت علی خان



روزنامہ
لاہور
THE DAILY
Pakistan
LAHORE
☎ 476301 - 5
جمعرات 16 رمضان 1413ھ 11 مارچ 1993ء 28 پھاگن 2049 ب

پی سی ایس کے امتحان اور ناخوشگوار واقعات

امان اللہ خان

پنجاب پبلک سروس کمیشن نے زیر اہتمام پی سی ایس کے امتحانات کے دوران پاکستان سٹڈیز کے پرچے کے کمی زیادتی انشاء اور غلط نمبر نے لکھ دیئے تھے کو چ انگار کر دیا ہے کیونکہ یہ واحد واقعہ تھا جس پر تمام امیدوار یکجا ہو گئے تھے۔ دوسرے امتحانوں کے برعکس یہاں شدید قسم کی مخالفت اور تنقید کی بجائے تائید اور پذیرائی سامنے آئی۔ اس کی وجہ تھی کہ کمیشن کی سلسلہ شکایت کو کبھی بھی حکومت نے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ مجبوراً حکومت نے جب کمیشن کے اختیارات کو ذیلی استعمال کرنا چاہا تو ملک بھر میں اس کے خلاف احتجاج شروع ہو گیا۔ نتیجتاً حکومت کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا بلکہ بعد میں اس حد تک کمیشن پر اعتماد کا اظہار کیا گیا کہ گریڈ 17 سے اوپر کی تمام بھرتیاں اس کے ذمے لگا دیئے گئے۔ پاکستان میں پہلی دفعہ پولیس انسپکٹر کی آسامیوں کمیشن نے اور پبلک پراسیکیوٹر کی آسامیاں بھی سب سے پہلے حکومت پنجاب کو حاصل ہوا۔ اس طرح یکمشت اینڈ کنٹرولر ایشن آفیسر ایسے کہ ایڈیشنل ایڈیشنل کمشنر، ڈپٹی کمشنر، آفیسر کی اسامیوں کیلئے بھی مشترکہ مقابلے کا امتحان سب سے پہلے حکومت پنجاب نے ہی شروع کیا۔ یہ اس دعوے پر مبنی تھا کہ حکومت کا کام ہے جس کی وجہ سے اس کی ذمہ داریوں میں مسلسل بڑھوتری کیا جا رہا ہے لہٰذا اس ادارے نے اب تک عوام کے اعتماد کو بھی برقرار رکھا ہے۔ قریب قریب ہر سال سے اس ادارے پر عوام نے اعتماد میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئی ہیں۔ دوسرے تعلیمی اداروں کی طرح اس ادارے میں بھی "پولی ٹیکنیا" نے اپنا تماشہ دکھایا ہے۔ چند ہی پہلے پولیس انسپکٹر کے تحریری امتحانات میں جس طرح نقل جلی اور جس طرح امتحانی مراکز کو کنٹرول میں رکھا گیا اس کا ذکر قومی اخبارات میں آ چکا ہے۔

چند سال تک تک پنجاب پبلک سروس کمیشن کے انعقادات صرف لاہور مراکز پر ہوا کرتے تھے اور دوران امتحان امتحانی محلے کی الٹی اہمیت ہوتی تھی کہ امیدوار اور تو در کنار امتحان امتحانی محلے سلا تھا۔ اس وقت امتحان سے کیسے ات تک پرچہ حیثیت رکھتا تھا اور علی الصبح وہی پرچہ سائیکلو سٹائل کروا کر اسی روز امتحانی مراکز پر بھیج دیا جاتا تھا اور نظام اتنا فول پروف تھا کہ پرچے کے آؤٹ ہونے یا پرچہ حیثیت کرنے والے سے رابطہ قائم کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جب سے لاہور کے علاوہ فیصل آباد، ملتان، بہاولپور میں امتحانی مراکز قائم ہونے ہیں اس راستے سے پرچہ حیثیت کرنے کا رجحان بھی سامنے آیا ہے۔ اسی سے تمام قباحتوں نے جنم لیا ہے۔ بااثر امیدواروں کا کمیشن سے کر کھلے اور پرچہ حیثیت کرنے والے پرچہ سے رابطہ قائم کر لیتے ہیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ پرچہ کو کل مراکز (جو زیادہ تر ضلعی کچہریوں میں قائم کئے جاتے ہیں) ان امیدواروں کا تحریری ملے پر پہنچا دیا اور اپنی مرضی سے پرچہ حل کر لیا جاتا ہے۔ ان حالات میں امتحانی مراکز قائم کرنے سے جس کمیشن کے فوائد حاصل ہونے تھے وہ الٹا نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ یہاں اس کی ذمہ داری بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کمیشن کا ان مراکز پر انتظامی کنٹرول بھی کمزور پڑا ہے۔ کمرہ امتحان مراکز کو بند بھی کر دیا جاتا ہے تو بھی امیدواروں کو سوائے چند کیسز کے کسی کو کوئی مشکل درپیش نہیں آتی کیونکہ ان مراکز پر نوکل امیدواروں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ زیادہ تر نقل شدہ پرچے شہروں اور دیہاتوں سے ہی آتے ہیں۔ دور دراز امتحان اپنے مراکز کے ساتھ یا ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں۔ ایسا ہونا بھی کر سکتے ہیں۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ اس امتحان میں صرف وہ لوگ شرکت کرتے ہیں جنہوں نے باقی کسی نہ کسی وجہ سے کم از کم ڈیڑھ امیدواروں نے ظاہر کیا ہوتا ہے۔ تین چوتھائی دو تہائی ہزار امیدوار عملی طور پر امتحان میں شرکت کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس سال گوجرانوالہ مرکز پر پرچہ سوشل سے صرف سوا سے لگ بھگ امیدوار امتحان دینے آئے۔

پی سی ایس کے نصاب اور پرچہ جات میں سالہا سال کی ترمیم بھی نظر طلب کی تقاضی ہے۔ ان پرچوں میں سوائے امیدوار کی یادداشت پرکھنے کے کچھ بھی پیمانہ نہیں کیا جاتا اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یا تو "پاس گو" آگے جاتے ہیں یا پھر رٹو طوطے پر دو قرار۔ اصل ضرورت پیچھے رہ جاتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ان پرچہ جات میں موضوعی سوالات کی نسبت معروضی سوالات کا تناسب زیادہ کر دیا جائے اور جو موضوعی سوالات دیئے جائیں امیدوار کی یادداشت کو پرکھنے کی بجائے اس کی قوت استدلال تجزیاتی صلاحیت اور معاملہ فہمی کو پرکھے۔ اس سے گائیڈوں اور خلاصوں اور "امتحانی مراکز پر مہیا کی جانے والی" کے سدباب میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔

پرچہ حیثیت کرنے والوں تک رسائی کو روکنے کیلئے بھی مستعد کی متعارف کروانا ضروری ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ کمیشن کم از کم پانچ مختلف مقامات سے پرچہ بند لفافے کروائے اور پھر ان لفافوں کو پرچہ حیثیت سے چند ساعت قبل کمیشن کے ایک ذمہ دار افسر کی موجودگی میں کھولا جائے اور پھر ان پرچوں کو ایک ہی وقت میں ایک ہی ٹیلی فون سے ایک ہی نمبر پر ٹیلیفون کر کے ان مراکز پر بھیجا جائے۔ اس طرح تمام مراکز پر پرچہ جات ایک ہی وقت میں پہنچ جائیں گے۔ اس طریقہ کار کو اختیار کرنے سے کمیشن کے ملازمین کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں

روزنامہ پاکستان
لاہور — اسلام آباد
راولپنڈی — ملتان
بروز اتوار 16 رمضان 1412ھ 22 مارچ 1992ء

نقطہ نظر

وفاقی شرعی عدالت اور کوٹہ سسٹم

امان اللہ خان (ایڈووکیٹ)

پہلے وفاقی شرعی عدالت نے کوٹہ سسٹم کو خلاف اسلام قرار دیا تھا۔ یہ فیصلہ آج تک کے تعلیمی اعداد و شمار میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ کوٹہ سسٹم کے خاتمے کے مطالبہ کے پس منظر میں سیاسی مفادات نے اپنا سکہ بھی بٹھایا ہے۔ جن میں اہم کردار بھی ملک کے تعلیمی اعداد و شمار کا ہے۔ عدالت کے اس فیصلے نے قوم کے مطالبے کی حقانیت اور بھی ثابت کر دی ہے۔

ہر معاشرہ معاشرے میں شہریوں کو برابر کا اختیار، رنگ، نسل، زبان، قبیلہ و جنس، ذاتی تعلیم، صلاحیت و اہلیت کے مطابق بہتر ملازمت اور تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہے اور اس حق کو دیانتدار حکومتوں سے استحصالی قوتیں بھی ختم کر دیتی ہیں۔

پاکستان کے آئین مجریہ 1973ء کے آرٹیکل 27(1) کے تحت بھی شہریوں کے اس حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر آئین کے نفاذ کے وقت اس سال کی مدت کیلئے اس حق کو معطل کر دیا گیا تاکہ پسماندہ علاقوں بالخصوص کوٹہ کی آبادی کے کامیاب سے سول سروس یا مختلف اداروں میں ملازمتوں کا حصول اور تعلیمی میدان میں ترقی یافتہ علاقوں کے شانہ بشانہ چل سکیں۔ اس آئینی تحفظ کو دیباچہ کی شق میں "کوٹہ سسٹم" کا نام دیا گیا۔ جس کے تحت ہر ڈویژن، ضلع، تحصیل اور دیہی تعلیمی اداروں میں درجہ ذیل تقسیم عمل میں لائی گئی۔

بلوچستان	10	=	فیصد
پنجاب	50	=	فیصد
سندھ	19	=	فیصد
سرحد	11.5	=	فیصد
آزاد کشمیر	4	=	فیصد
بالائی علاقہ جات	3.5	=	فیصد
وفاق	2	=	فیصد

سب ڈویژن کو حدود کے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

حلقہ شہری۔ کراچی، حیدر آباد، سکھر، کوئٹہ، خضدار اور کالعدم بلوچستان کا علاقہ۔

حلقہ دیہی۔ باقی علاقہ جات۔

حلقہ شہری سیٹیں۔ 40 فیصد میرٹ۔ 6 فیصد۔

حلقہ دیہی کیلئے۔ 60 فیصد میرٹ۔ 4 فیصد۔

اسی طرح حلقہ کی صوبائی سروسز، تعلیمی اداروں میں داخلہ کیلئے بھی مناسب تقسیم کیا گیا جب کہ بلوچستان کی ڈومیسائل کی شرط بھی ختم کر دی گئی اور صوبہ میں دیگر علاقے کی طرح شہری علاقے کی تقسیم رکھی گئی۔ صرف صوبہ پنجاب میں صوبائی سروسز کی حد تک اور اس کے اندر ڈویژنل کی اصطلاح استعمال کی گئی۔

دراصل یہ جس میں ذاتی یا خطہ علاقے شامل تھے کا ذکر نہیں صدارتی آرڈیننس مجریہ 1985ء (جس میں ہر ڈویژن کی سات اضلاع کی تقسیم کی گئی) کے تحت 40 فیصد کا اضافہ کیا گیا۔ اس انتظام کے سب سے زیادہ تعلیم کا کوٹہ حیدر آباد اور سکھر کے ڈویژن کو ملا۔ کیونکہ تعلیم کا کوٹہ سب سے زیادہ تھا شہروں میں مقابلہ اس قدر شہروں کے لڑکوں کیلئے وفاقی میں صرف 6 فیصد کوٹہ مقرر تھا جبکہ دیہی علاقوں کا کوٹہ 60 فیصد تھا یہ بھی کہا گیا۔ اس سے دیہی علاقے کے لوگوں کو ملازمت (سرکاری) کے دروازے بند ہونے چلے گئے اور مقامی بے روزگاری اور غیر مطمئن مشتعل نے ایسی شکل دکھلائی۔

کوٹہ سسٹم کو برداشت کرنے کے عرصہ میں کئی وقت جو دانش رہنے گئے اور جنہیں آج تک صلاحیتوں کا پابند ہونا چاہیے وہ پیدا کر بڑے عہدے اور درجے شہروں میں منتقل ہونے لگے اور دیہات میں رہنے والے اور پسماندہ علاقوں کے باسیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شہری علاقوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ، بہترین ڈیپارٹمنٹ، ترقی یافتہ ذرائع نقل و رسائل، تعلیمی سہولتوں کی فراوانی اور دیہی تعلیمی سہولتیں، بنیادی ضروریات سے محروم علاقوں کی تعلیم میں کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ اس کے برعکس پسماندہ علاقوں میں یہ سہولتیں تو دور کی بات

روزنامہ
پاکستان
لاہور
THE DAILY
Pakistan
LAHORE
ٹیلی فون 476301 10
جلد 1 | 9 شعبان 1411ھ 25 فروری 1991ء 13 پھاگن 2047ب صفحات 12 قیمت 3 روپے | شمارہ 231

لاہور مرغا کیس کا قانونی جائزہ

ایمان اللہ خان

14 فروری 1991ء کے اخبارات میں ایک تصویر شائع ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی ہر قوم کا مرد و زن سے جھٹکا لگا۔ آنکھوں کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تصویر ان بدنصیب معذور قوم کی تھی جو قلعہ لوڑ ہل میں کسمپرسی اور اسارت کے عالم میں "مرغا" بنے ہوئے تھے۔

پولیس کے ہاتھوں یوں تو کسی بھی کی عزت محفوظ نہیں۔ ہر شریف آدمی اس سے خوف کھاتا ہے کہ دھن کی وہ ساتھ لگی یہ واقعی تحریر اس تصویر میں سپرنٹنڈنٹ، ایس پی، سٹنٹ سپرنٹنڈنٹ اور دیگر اسٹاف کو ہر گورنمنٹ سٹنڈل ہال سکول کے انتظامی مرکز پر فرائض سرانجام دے رہے تھے جس تو ہین آمیز انداز میں، کھانا کھایا، پانی نوشی کی، اسے مثال ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یا تو صوبہ میں قانون نام کی کوئی شے موجود نہیں یا پھر ارباب اختیار کے اخلاق اس درجہ پست ہو گیا ہے کہ ہم اپنی بڑی بڑی باتوں کو بھی پسینے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ جناب نیشنل ریزرو فورس کے افسران کے مطابق سے کے بعد صوبائی وزیر تعلیم جناب میر افضل نے پولیس کی "اس حرکت" کے بارے میں رپورٹ طلب کر لی ہے مگر ذہنوں میں سوال پیدا ہوتے ہیں کہ صرف "رپورٹ" طلب کرنے سے کیا ان اساتذہ کی عزت بحال ہو جائے گی جنہیں پولیس نے انتظامات کے دوران ذلیل و رسوا کیا یا اساتذہ اپنے شاگردوں کے سامنے اسی طرح درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھ سکیں گے یا کیا وہ اپنے وہ ستوں سے ملنے والوں اور روزی یاروں کے سامنے اسی طرح تن کر چل سکیں گے یقیناً ان سوالوں کا جواب نفی میں ہو گا۔

اسی نوعیت کے واقعات سے پنجاب پولیس کے دو کارنامے "سانحہ گجیل کیس" اور "سانحہ دور کا پروفیسر حسنی کیس" تو ضبط ہوا تھا کہ ایک بار پھر قدرت اللہ شہاب یاد آ گئے اور اس واقعہ پر پھر لکھنے کیلئے اساتذہ کو ہی انتخاب بنایا گیا۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ پولیس کو تعلیمی اداروں میں دخل اندازی کی ضرورت کس نے اور کیوں دی؟ کیا پولیس کا فرض منصبی ہے کہ وہ انتظامی مراکز میں نقل کا سدباب کرے یا پھر جسٹریٹ صاحبان کی ذمہ داری ہے کہ وہ "انتظامی عملے" کو پیک کرتے پھریں اور حساس امور کو پس پشت ڈال کر نقل کرنے یا کرانے والوں کو پکڑتے پھریں، وقتاً فوقتاً اس سوال کا جواب بھی ملنا چاہیے۔

جہاں تک ہماری قانونی معلومات کا تعلق ہے پولیس یا جسٹریٹ کی ذمہ داری محض اتنی ہے کہ وہ "انتظامی مراکز" کے باہر "لا اینڈ آرڈر" برقرار رکھیں اور غیر متعلقہ افراد کو انتظامی مراکز کے اندر داخل ہونے سے روکیں اور انتظامی مراکز کے اندر سے سپرنٹنڈنٹ کے توسط سے آنے والی ہدایات کا انتظار کریں۔ انتظامی عملہ کو پیک کرنا، راہ داری کرنا، حاضری کی ذمہ داری ہے۔ ان کے اپنے قوانین ہیں جس کے تحت انہوں نے عمل کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے ڈسٹرکٹ جسٹریٹ صاحبان نے انتظامی مراکز سے باہر دفعہ 144 ض ف کا نفاذ کر رکھا ہے جس کے تحت غیر متعلقہ افراد کا انتظامی مراکز میں داخلہ ممنوع ہے مگر اس سلسلے میں انتظامیہ سے تجاوز کیا گیا۔ اگر بفرض محال انتظامی عملہ پر رقم لے کر نقل کروانے کا الزام تھا تو اس کیلئے ایک باقاعدہ طریق کار مقرر ہے۔ ضابطہ فوجداری ستتل کے تحت قوانین موجود ہیں جن کے تحت کارروائی کی جا سکتی ہے۔ مقدمہ کارروائی ممکن ہے۔ مگر یہ کسی بھی قانون کی کتاب میں نہیں لکھا کہ تھانے دار والوں کا کام کرنا شروع کر دیں۔ سزا پانے کا فیصلہ ہم انہوں نے شاید کو مدنظر رکھا کر اور قوانین کا تضاد نکلنے کے بعد کر چکا ہے۔ مگر یہ کس ضابطے میں لکھا ہے کہ معذور قوم کو "مرغا" بنا کر فوٹو گرافروں کے سامنے پیش کر دیا جائے اور ان کی تصاویر اخبارات میں سطور اول پر شائع کرانے کا اہتمام کیا جائے؟ یہ اخبارات قوام بالغرض پڑھے جاتے ہیں۔ دوسرے ممالک کے طرز جب اساتذہ سے پاکستانی قوم کا سلوک دیکھیں گے تو یقیناً وہ طلبہ کے بارے میں کبھی رائے قائم نہیں کر سکتے۔


عثمان انور مجید

آخر کس نے قصوروار ہیں اگر یہ سب کچھ ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ پانچ بیس سکیل کا پٹواری کریڈ سترہ کے ڈاکٹری حاضری لگانا پھرے کہ وہ ایمانی ہی موجود ہے یا نہیں؟ بلکہ پٹواری اور سکیل کے دیگر ونٹر ملازمین کی اپنی حیثیت کبھی کبھی نہیں رہی۔ اگر ان سب حرکتوں سے پچ شیدہ ہاتھ کس قسم کی بہتری کی توقع کرتے ہیں اور وہ کیا قومی فریضہ سرانجام دے رہے ہیں؟ کیا یہ ایک محکمہ کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے ساتھ ساتھ اس پیشہ سے وابستہ افراد کی توہین نہیں ہے؟

اس قسم کی حرکتوں کی وجہ سے شعبۂ تدریس اور طب سے وابستہ افراد بددل ہو چکے ہیں اور وہ سول سروس کا رخ اختیار کر رہے ہیں۔ اس وقت مرکزی سول سروس میں اکثریت ڈاکٹر حضرات اور انجینئرز کی ہے جو ہر سال اپنے پیشوں کو چھوڑ کر اس طرف راغب ہو رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہمارے ان پیشوں کی پستی ہو گا کیونکہ جس انداز سے ان معزز پیشوں کی توہین و تذلیل کا سلسلہ جاری ہے وہ دن دور نہیں جب نوجوان افراد ڈاکٹر یا استاد بننے کی بجائے پٹواری لگنے کو ترجیح دیں گے۔

اساتذہ کو ہر معاشرے میں عزت و احترام کا مقام حاصل ہے۔ اسلامی معاشرے کی تو بات ہی اور ہے، مشرقی معاشرے میں بھی ان کو وہ مثالی باپ کا مقام دیا جاتا ہے۔ ایسے میں اگر ان سے کوئی غلطی ہو بھی جائے تو اس میں ان کا احترام ہر صورت ملحوظ رکھنا چاہئے تھا۔ اگر اس سلسلے معاملے کو بھی قانون کے دائرہ میں رکھا جاتا تو شاید نوبت انتظامیہ تک نہ پہنچتی۔ اگر اساتذہ کے ساتھ پیش آنے والے اس واقعہ کی روشنی میں پولیس کے اختیارات و فرائض کا ہی ایک چارٹ بنا لیا جائے اور "قضیہ فوراً" نظام کو بدلنے کی کوئی تحریک چلائی جائے تو اس سے بہتوں کا بھلا ہو گا۔

اس لئے حکومت صوبہ پنجاب کے طرز و سلوک پر اعلیٰ کو اس طرف توجہ دینی چاہئے اور ان افراد کا حق سے حساب کرنا چاہئے جو اپنی ہٹ دھرمی کی تکمیل میں اداروں کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور اس بات کا بھی خصوصی بندوبست ہونا چاہئے کہ پولیس یا انتظامیہ دوسرے خود ساختہ محکموں یا اداروں پر "قانونی داری" نہ کر سکے۔ ہر محکمہ اپنی حدود اور قواعد و ضوابط کے تحت باعزت طریقے سے کام کرے۔



پی سی ایس افسران کے مسائل

کوٹہ سے زائد پی سی ایس افسران کو مرکز میں بھیجا جائے :

پی سی ایس اکیڈمی کو جلد از جلد فعال بنایا جائے :

تحریر : امداد اللہ خان :

پنجاب اسمبلی کے حالیہ اجلاس میں صوبائی اسمبلی کے ممبران کی تحریک استحقاق پر سپیکر جناب اسمبلی میں مقیم مسودہ قانون پی سی ایس افسران کے مسائل کے لیے جہانگیر کمیٹی "سفارش" کرے گی جو اگلے اجلاس میں اپنی رپورٹ پیش کرے گی کہ پنجاب اسمبلی کی ۱۹۹۶ء کی قرارداد پر عمل کیوں نہیں ہو سکا۔

برصغیر پاک و ہند میں ایسے ادارے کی کمی محسوس کی جا رہی تھی جو تمام گریڈ ۱۷ سے ۲۰ تک کے افسران کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں ایک ایک پبلک سروس کمیشن کی موجودگی میں ایسے افسران کی تعیناتی کے لیے سلیکشن کرتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان کے ہر صوبے میں ایک پبلک سروس کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔ پھر ان کمیشنوں کی ذمہ داری میں اضافہ کرتے ہوئے ان کا نام صوبائی پبلک سروس کمیشن رکھ دیا گیا۔ ان کمیشنوں کے ذمہ صوبائی سروسز کے افسران کی بھرتی کا کام لگایا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک یہ کمیشن اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد تین سول سروسز کے افسران نے پاکستان کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے نام تھے پاکستان ایڈمنسٹریٹو سروس کا نام پاکستان ایڈمنسٹریٹو سروس قائم ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں سول سروسز آف پاکستان کے نام سے سول سروسز کا ایک اور گروپ قائم کیا گیا۔ اس گروپ کو پی ایس پی کا نام دیا گیا ہے۔ ۱۹۷۴ء کی اصلاحات کے بعد اسے پی ایم جی یا ڈی ایم جی کا نام دیا جاتا رہا ہے۔

اس وقت مختلف انتظامیہ میں دو درجن کے قریب افسران کی ضرورت کو خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ کسی بھی ملک کی ترقی میں اس کے افسران کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر ممالک میں ان افسران کا کردار اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے ان افسران کو ترقی دینے کے لیے ہر ملک اپنے اپنے طریقے سے کوشش کرتا ہے۔

پی سی ایس افسران اور دیگر پی ایس افسران کے طریقہ انتخاب میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں طریقہ انتخاب کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ پبلک سروس کمیشن کے تحریری امتحان کے بعد انٹرویو کے ذریعے ہی ان افسران کو منتخب کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان افسران کو ٹریننگ کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کو مختلف محکموں میں تعینات کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان افسران کی ترقی کی ذمہ داری ان کے متعلقہ محکمہ پر ہوتی ہے۔

پی سی ایس افسران کو ۲۰ سال کی سروس کے بعد ان کی کارکردگی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کو ترقی دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کو ۲۵ سال کی سروس کے بعد ترقی دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کو ۳۰ سال کی سروس کے بعد ترقی دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کو ۳۵ سال کی سروس کے بعد ترقی دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کو ۴۰ سال کی سروس کے بعد ترقی دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کو ۴۵ سال کی سروس کے بعد ترقی دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کو ۵۰ سال کی سروس کے بعد ترقی دی جاتی ہے۔

پی سی ایس افسران کو ترقی دینے کے لیے ان کی کارکردگی کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اس کے لیے ان کی سالانہ رپورٹ کو دیکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کو ترقی دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کو ترقی دینے

روزنامہ
THE DAILY
پاکستان
Pakistan
جمعرات 26، شوال 1412ھ 30، اپریل 1992ء 18، ویساکھ 2049ب

پاکستان کا بجٹ بنانے والے میرے گھر کا بجٹ بنا دے !

ایمان اللہ خان (وہاڑی)

پاکستان کے مالی سال 93-1992ء کیلئے بجٹ کی تیاریاں اس وقت عروج پر ہیں۔ بجٹ سے پہلے آنے کی قیمتوں میں اضافے نے آسمان و بجٹ کے خدوخال کو ابھار کر نمایاں کر دیا ہے۔ روپے کی قیمت میں تیس فی صد کمی، مجلی کی قیمت میں سو فیصد اضافے، اشیائے صرف اور گیس کی قیمتوں میں اضافے کی "نوید" مختلف حلقوں میں زور و شور سے زیر بحث ہے۔ ہر مخلص اہلیہ اپنے بڑے وقت کے تصور سے ہی لرزاں ہے۔ ہر شوہر کی طرح سرکاری ملازم بھی مہنگائی کے اس عفریت سے خوف زدہ ہیں۔

میں ایک گریڈ سترہ کا افسر ہوں۔ مجھے مختلف سے سرکاری رہائش گھر بھی ملی ہوئی ہے اور میری تنخواہ بھی ایک چھوٹے سے شہر میں ہے۔ جہاں ضروریات زندگی بڑے شہروں کی نسبت ارزاں ہیں۔ مجھے اس وقت حکومت یا طلب کی طرف سے ہر مہینہ جو کچھ ملتا ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے۔

1-	بنیادی تنخواہ۔	00 2870 روپے
2-	سواری الاؤنس۔	اطلاق نہ ہونا ہے
3-	طبی الاؤنس۔	اطلاق نہ ہونا ہے
4-	ہاؤس رینٹ۔	مکان ملا ہوا ہے
5-	کوئی الاؤنس۔	نہ ملتا ہے

اس تنخواہ میں کٹوتیاں جو لازمی ہیں حسب ذیل ہیں۔

1-	کرایہ مکان (15 فی صد)	- 50 143 روپے
2-	جی پی فنڈ۔	00 250 روپے
3-	گروپ انشورنس۔	00 30 روپے
4-	بہبود فنڈ (2 فی صد)۔	00 58 روپے
	کل رقم -	50 481 روپے
	تنخواہ۔	50 2288 روپے

یہ رقم ہر ماہ گھر لے جاتا ہوں اور اس سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے ساتھ ساتھ "افسری" اور "سفید پوشی" کا بھرم بھی قائم رکھتی کو مشکل کرتا ہوں۔ میں حکومت کا ملازم اور ملازم ہوں۔ الی ایڈمائی دوائر کے قحط پر ہوں سمجھتا ہوں کہ میں ہر موجود ہوتا ہوں۔ سرکاری ملازمت کے علاوہ میرا نہ کوئی ذریعہ معاش ہے نہ کوئی سائیڈ بزنس۔ حرام کی کمائی اور رشوت پر میں لعنت بھیجتا ہوں۔

میرا مختصر سا خاندان ہے۔ یعنی خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرتے ہوئے ایک بیٹی اور ایک بیٹے کا باپ ہوں۔ دونوں بچے پرائمری سکول میں زیر تعلیم ہیں۔ یہ بچے بڑے لوگوں کے بچوں کی طرح ایلیٹ کلاس یا کیڈٹ کالجوں میں نہیں بلکہ معمولی نوعیت کے گورنمنٹ سکول میں زیر تعلیم ہیں۔ پورے پاکستان میں ہمارا کوئی رشتہ دار نہیں۔ جس کی شادی تھی میں ہم شریک ہو سکیں یا کوئی ہمارے پاس آ سکے یا ہم اس کے پاس جا سکیں۔ ہم نہ کوئی کار، فریج، موسمی ہیٹر، ٹی وی وغیرہ نہیں رکھتے۔ ہمارے ہاں کوئی ملنے والا آ جائے تو ہم صرف خلوص سے اس کی تواضع کر سکتے ہیں۔ باقی لوازمات کے ہم روادار نہیں۔ سگریٹ نوشی، فلم بینی اور سیر و تفریح کی ہمیں عادت نہیں۔ ہمارے گھر کبھی موسمی پھل نہیں آتا۔ ہمارے بچے دنیا کے سادہ و شاکر ترین بچے ہیں۔ انسان نے ذرا تنگدستی کا یوں پھلوں کی تصاویر دیکھی اور بھلی ہیں مگر اس کے ذائقے سے آشنا تک نہیں۔ یہ بچے حساس طبیعت کے ہیں اور وقت سے پہلے ہی "بڑے" ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم اور ہمارے بچے کبھی بیمار نہیں پڑتے۔ کیونکہ ہمیں پتہ ہے کہ بیماری کی صورت میں ادویات کے مل بھر اوا نہ کر پائیں گے۔ اس لئے ہم بیمار ہونے کی "عیاشی" کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

ہمارے بچے سکول یونیفارم کے علاوہ صرف عید پر نئے کپڑے خریدتے ہیں اور سارا سال پھٹا ہی کپڑوں میں گزارہ کرتے ہیں۔ یہی حال ہم میاں بیوی کا ہے۔ ہم ایک ایک جوڑا گرمیوں کیلئے اور ایک ایک جوڑا سردیوں کیلئے بناتے ہیں اور اسی میں سارا سال گزار دیتے ہیں۔ ہمارے بچے فی کلاس کیلئے ایک ہی کتابیں نہیں خریدتے بلکہ سیکنڈ ہینڈ کتابوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ میں روزانہ انہیں ایک ایک روپیہ جیب خرچ کیلئے دیتا ہوں۔ یہ نہیں وہ اس "روپے" سے اپنی کن کن ننھی ننھی خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں۔ وہ اپنے کسی دوست کو گھر آنے کی دعوت نہیں دے پاتے کیونکہ ان کے پاس نہیں کھانے یا کھیلنے کیلئے کھلونے تک نہیں۔ وہ کسی دوست کی سالگرہ تک میں شمولیت اختیار نہیں کر پاتے کیونکہ ان کے پاس گفٹ کیلئے پیسے اور پہننے کیلئے نئے کپڑے تک نہیں ہوتے۔ یہ بچے کبھی ضد نہیں کرتے کیونکہ وہ اتنا باشعور ہو چکے ہیں کہ انہیں علم ہے کہ ان کا والد گھر صرف 2288 روپے لے کر آتا ہے۔

ایک دن انگلیمبہ کے ایک افسر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میرا چھوٹا بیٹا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ باتوں باتوں میں اس دوست نے بتایا کہ حکومت خواتین میں مفت ہر حوالگی پر بیس روپے یومیہ خوراک کی مد میں خرچ کرتی ہے۔ اس پر میرا بچہ جو وہ سرکاری جماعت کا طالب علم ہے چونک پڑا اور حساب لگا کر اگلی اس طرح حکومت ہر حوالگی پر 600 روپے ماہانہ خرچ کرتی ہے اور یہاں قیدیوں پر 2400 روپے جو اس طرح چار حوالگیوں کے کھانے پینے پر حکومت جو رقم خرچ کرتی ہے وہ ہمارے ہی کنواں سے بھی 112 روپے زائد ہے اور ان حوالگیوں کو تو کام کرنا پڑتا ہے مفت سکان کا کرایہ دینا پڑتا ہے اور نہ بجلی کا بل اور وہ پورا اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ کبھی تو انہیں جیل میں ڈالا جاتا ہے۔ جب اسے بتایا گیا کہ جب کسی عام ملزم کو عدالت سزا دے دے تو اسے جیل میں دو دن بھی مفت ملتی ہے۔ وہ اگر کوئی بڑا جرم کا قیدی ہو تو اسے جیل میں بی کلاس بھی مل جاتی ہے اور بی کلاس کے قیدی کو ملنے والی سہولتوں کی رو داد جب اسے سنائی گئی تو نخاطبین بے اختیار پکار اٹھا۔

"انکل کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ حکومت ہمیں بھی بی کلاس قیدی کا درجہ دے دے اور ہم اپنی مرضی کا لے لے"۔

کئی سیٹوں سے پھکڑ حاصل کر کے جب اخراجات و آمدنی پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ شاید ہمارا گھر کا بجٹ متوازن نہیں۔ اخراجات زیادہ مناسب ہیں۔ وہ تو کیسے ہو سکتا ہے کہ چار افراد پر مشتمل گھر نہ اس کمپیوٹر کا مالک ہو۔ حساب و کتاب کچھ مندرجہ ذیل نکل سامنے آ گئے۔

1- دونوں بچوں کی نئیں سعد کاپی پنسل اور نرسیمیٹ کا خرچہ۔ 00 200 روپے ماہانہ

2- بجلی کا بل سعد بلب وغیرہ۔ 00 200 روپے ماہانہ۔

3- گیس سلنڈروں کا بل سعد سلی کا بجلی وغیرہ۔ 00 160 روپے ماہانہ

4- دودھ 2 کلو روزانہ کے حساب سے 360.00 روپے ماہانہ۔

میزان 920 روپے

اس طرح 2288.50 روپے کی رقم میں سے ان باتوں کی ادائیگی کے بعد 1368.50 روپے کی بچت ہوگی۔ پھر خیال آیا کہ بھی عید گزر گئی ہے۔ بچوں کی کتابیں یونیفارم اور سال کے کپڑے بھی اوھار لے کر سلوائے گئے تھے ان کی قسط بھی دینا ہے۔ وہ حساب یوں نکلا۔

1- بچوں کی کتب فی کلاس کیلئے سعد کاپیاں و دیگر فی 00 200 روپے

2- یونیفارم دونوں بچوں کے سعد جوتے (سال بھر کیلئے) 00 600 روپے

3- بچے اور بچی کے عید کے کپڑے ہر سال سلیں گے۔ 00 500 روپے

4- اپنے کپڑے سردیوں و گرمیوں کے سعد جوتے وغیرہ 00 500 روپے۔

5- وردی کے کپڑے اور دونوں موسموں کیلئے۔ 00 500 روپے

6- عید پر سویٹ ڈش و عیدی کا خرچہ۔ 00 100

کل۔ 2400 روپے سالانہ۔

اس طرح ہر ماہ 200 روپے قسط کی ادائیگی کے بعد بقی رقم 1168 روپے بچے گی۔

یہ رقم پہلے سے بچی ہوئی رقم میں سے دی کہ وہ اس سے سلائی وغیرہ کی ادائیگی کر کے گھر کے کام کا انجام کرے اور اس اندازے کرے کہ افسری اور سفید پوشی "مسلسل" میں فرق نہ پڑے۔ ابھی کل ہی اس نے پنسلی سٹور کا فل ہاتھ میں تھما دیا اس کی تفصیل یوں ہے۔

1-	شیونگ کریم۔	00 7 روپے
2-	ریزر۔	00 24 روپے
3-	ٹوتھ پیسٹ۔	00 18 روپے
4-	ٹوتھ برش۔	00 12 روپے
5-	بچوں کے پانچ۔	00 15 روپے
6-	سلائن تھائے کیلئے۔	00 30 روپے
7-	کپڑے دھونے کا صابن وغیرہ	00 50 روپے
8-	دم پاؤڈر۔	00 24 روپے
9-	ٹوتھ برش۔	00 20 روپے
10-	چائے کی پتی۔	00 30 روپے
11-	چینی دس کلو۔	00 120 روپے
12-	گھی ایکڑا۔	00 115 روپے
13-	بچوں کا جیب خرچ۔	00 60 روپے
14-	متفرق ہاؤسی ٹیک مصالحہ جات۔	00 100
	کل۔	00 625 روپے۔

اور آٹا اور چاول کا حلیہ مل کچھ یوں تھا۔

آٹا۔	00 154	روپے
چاول۔	00 240	روپے
میزان۔	00 394	روپے۔

اس طرح 394+625 روپے یعنی 1019 روپے خرچ ہو گئے ہاتھ کے پاس 149/ روپے رہ گئے ہیں۔ اب اس نے اس رقم میں مزید 5 روپے روزانہ کے حساب سے باقی اخراجات پورے کرنا ہیں۔ سبزی کا خرچ اٹھتے کا خرچ، بچوں کی توڑ پھوڑ، کسی آنے گئے مہمان کی خاطر مدارت کا خرچ، بچوں کی فرمائشوں کا خرچ اور اس نے یہ تمام اخراجات میرے سامنے رکھ کر ایک ہی سوال کیا ہے کہ تم اقتصادیات کے طالب علم ہو، ہو اور ایک ذمہ دار عہدے پر بھی ہو۔ تو گھر کا بجٹ بنا۔

میں سوچ رہا ہوں کہ قومی بجٹ سے پہلے میرے گھر کے بجٹ کا پہ حل ہے تو بجٹ کے بعد کیا ہو گا۔ میں اگر گریڈ سترہ کا افسر نہ ہوتا ہے اس وقت ہوتا تو میرے دفتر کا کلرک ہی مجھ سے صرف پانچ سو روپے ماہوار میں آٹھ بچوں کا پیٹ پالنے کے کسی حل میں ہو گا۔ وہ تو کسان بھی کرائے پر لے کر رہا ہے۔ اس کے تو پانچ بچے سکول جاتے ہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ ہمارے وزیر خزانہ ایک بلیو بجٹ ساز ہیں۔ وہ اتنے بڑے ملک کا بجٹ بنا سکتے ہیں تو میری اور میرے جیسے لاکھوں ملازمین کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے وہ ہماری مدد کیوں نہیں کریں گے اور آئی ایم ایف کی طرح کم از کم یہ مشورہ تو دے سکتے ہیں کہ میں اپنے گھر کے کوئلے اخراجات میں کنٹرول کروں کہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رہ سکے۔ وہ میرا گھر کا بجٹ بنانے میں میری مدد کریں یا پھر بجٹ کو کم از کم اس حد تک۔ بچے دیں کہ میں اور میرے بچے فاقوں کے باعث مرنے پر مجبور نہ ہو جائیں یا پھر میں "اکرو" کے قحط "حرام خوری" پر مجبور نہ ہو جاؤں۔ ■■

☆ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر اسلام لائے تو اسلام عزت کی راہ پا گیا۔ آپ کا اسلام لانا اور اسلام کی فتح تھی۔ آپ کی ہجرت نصرت تھی آپ کی امامت رحمت تھی۔ اس سے قبل ہم کعبۃ اللہ میں نماز نہ پڑھ سکتے تھے، لیکن جب حضرت عمر ایمان لائے تو آپ نے مشرکین سے اس قدر جہاد و قتال کیا کہ انہیں مجبوراً انہیں کعبۃ اللہ میں نماز پڑھنے کی اجازت دینا پڑی۔ (رحمتہ للعالمین)


باقاعدہ تصدیق شدہ اشاعت ABC CERTIFIED پاکستان کے سب سے بڑے روزنامہ کا اعزاز

THE DAILY JANG MULTAN

روزنامہ جنگ ملتان

بانی ـــ میر خلیل الرحمٰن بمنتہ

جلد 1 | بروز 27 شوال 1423ھ 2 جنوری 2003ء 17 پوس 2059ب | شمارہ 84

سب سے پہلے پاکستان

امان اللہ خان

گزشتہ روز صدر مملکت جناب پرویز مشرف صاحب نے قوم کو ایک خطاب سے نوازا ہے جس کا خلاصہ اور لب لباب یہ تھا کہ "سب سے پہلے پاکستان" اس بات کو ہر طرف سے اس پر کوئی قابل عمل حل نکالنا ہے اگر دیکھا جائے تو 11 ستمبر کے واقعے کے فوراً بعد امریکی یہ کہا تھا کہ یہ سب اچانک کیسے ہو گیا ایک آن میں امریکی بلڈنگ، تجارت، تجارت، عمارت سب خاک میں مل گئی۔ سینکڑوں فائر بریگیڈ جو قابل تحسین قرار پائے تھے وہ بھی ملبے میں دب کر رہ گئے۔ ہزاروں لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ امریکہ کو مکمل تباہ و برباد کر دینے والی سپر پاور اور خطہ کی بااثر ترین طاقت قرار دینے والے ہر طرف سے دشمنوں میں گھر گئے۔ ان کی آواز میں بھی وہ دم خم نہ رہا جو کہ ہر وقت ہوا کرتا تھا۔ ان کی گرجدار آواز کو ایک دم سانپ سونگھ گیا۔ امریکہ کی ہر طرف سے مذمت ہونے لگی۔ ہر کوئی امریکہ کو ہی مورد الزام ٹھہرانے لگ



عراق پر متوقع حملے کے اثرات

امان اللہ خان

[illegible]